ڈاکٹر بلند اقبال کی تخلیقی جہات، تحقیقی اور تنقیدی جائزہ

تحقیقی مقالہ برائے ایم فل اُردو

مقالہ نگار

محمد فاروق

رول نمبر ۱۴

نگرانِ مقالہ

ڈاکٹر حماد رسول

استاد شعبۂ اُردو

شعبۂ اُردو

بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

۲۰۲۱ء-۲۰۲۳ء

بسم الله الرحمن الرحيم

اللهم صل على محمد وآل محمد

انتساب

اے خدائے ذوالجلال میں جب جب تیری رحمت کے بارے میں سوچتا ہوں تو وہ میرے والدین کی صورت میں سامنے آ جاتی ہے۔

اظہارِ تشکر

شمیم فاروق ۔۔۔ میری حیات، میری کائنات، میرا ثبات تمہاری محبتوں کے بنا اِس مقالے کی تکمیل نہ مکمل تھی ۔ عفان ابراہیم، عبدالرحمان اور اعراف فاطمہ فاروق میری زندگی کے حسین خوابوں کی منزلیں میرے جگر کے ٹوٹے تمھارے پیار بھرے لہجے اِس مقالے کے صفحوں پر تتلیاں بن کر رنگ بکھیرتے رہیں۔

ڈاکٹر حماد رسول صاحب

آپ کی ماہرانہ ترتیب و تدوین کی وجہ سے میری زندگی کا تخلیقی سرمایہ اس حسین مقالے کی صورت میں پیش آیا۔

حلف نامہ

میں حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ زیرِ نظر تحقیقی مقالہ بعنوان **''ڈاکٹر بلند اقبال کی تخلیقی جہات، تحقیقی اور تنقیدی جائزہ''** میری ذاتی محنت اور کاوِش کا نتیجہ ہے۔ اس عنوان کے تحت یہ مقالہ کسی بھی یونیورسٹی میں کسی ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا گیا۔

محمد فاروق

رول نمبر ۱۴، ایم فل اردو

شعبۂ اردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان

سیشن ۲۰۲۱ء— ۲۰۲۳ء

تصدیق نامہ

اس امر کی تصدیق کی جاتی ہے کہ میں نے ایم فل اُردو کے طالب علم **محمد فاروق**، رول نمبر ۱۴، سیشن ۲۰۲۱ء — ۲۰۲۳ء کے تحقیقی و تنقیدی مقالہ بعنوان ''**ڈاکٹر بلند اقبال کی تخلیقی جہات، تحقیقی اور تنقیدی جائزہ**'' کا مطالعہ دِقتِ نظر سے کیا ہے۔ میں طالب علم کے تحقیقی کام سے مطمئن ہوں اور اجازت دیتا ہوں کہ ان کا یہ مقالہ ایم فل (اُردو) کی ڈگری کی جانچ کے لیے جمع کروادیا جائے۔

ڈاکٹر حماد رسول

اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو

بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان

فہرست

عنوان		صفحہ نمبر
پیش لفظ		01
باب اول :	ڈاکٹر بلند اقبال سوانح و شخصیت	03
باب دوم :	ڈاکٹر بلند اقبال بطور افسانہ نگار	22
باب سوم :	ڈاکٹر بلند اقبال بطور ناول نگار	81
باب چہارم :	ڈاکٹر بلند اقبال بطور مکالمہ نگار	137
باب پنجم :	محاکمہ	189
	کتابیات	225
	ضمیمہ جات	228

پیش لفظ

سب سے پہلے اللہ پاک کی ذات کا دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں جس کے قبضۂ قدرت میں میری اور ہر ذی روح کی جان ہے۔ اور اس پاک ذات کا اس بات پر بھی تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ اُس نے مجھے اس قابل بنایا کہ آج میں ایم فل کا مقالہ لکھنے کے قابل ہوا۔

اِس مقالہ کی تکمیل میں چند ہستیوں کا بے حد مشکور ہوں جن کی مدد محبت، حوصلہ اور راہنمائی کی وجہ سے میں اِس قابل ہوا۔ سب سے پہلے اپنے والدین کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی دعاؤں کے صدقے میں ایم فل اُردو کا طالب علم بن چکا ہوں۔ اِس کے بعد اپنی شریکِ حیات اور اپنے تمام بہن بھائیوں کا بے حد ممنون ہوں جو ہمیشہ مجھے مقالے کے لئے متحرک رکھتے تھے اور میری کامیابی کے لئے ہمیشہ ہمیشہ دعا گو رہے۔

میرے اپنوں کے ساتھ ساتھ میرے تمام اساتذہ کرام کا بھی میری اس کامیابی میں بہت بڑا ہاتھ ہے۔ خاص طور پر نگران مقالہ ڈاکٹر حماد رسول صاحب کا بے حد مشکور ہوں جنہوں نے دورانِ مقالہ قدم قدم پر میری راہنمائی کی۔ اِن کی شفقت اور محبت کے لئے میرے پاس الفاظ موجود نہیں ہیں۔

لیکن ایک ہستی کو میں کیسے بھول سکتا ہوں اُن کا ذکر تو میرے اوپر واجب ہے۔ میں محبت اور شفقت کے جتنے بھی الفاظ لکھوں وہ اُن کی شخصیت کے آگے صفر کی مانند ہیں۔ وہ شخصیت ڈاکٹر بلند اقبال ہیں اپنے نام کی طرح ایک بلند اخلاق کے حامل انسان ہیں۔ جو میڈیکل جیسے مصروف پیشے اور کینیڈا جیسے ترقی یافتہ ملک میں مجھ

سے ہزاروں میل دور رہ کر بھی مجھ جیسے نالائق طالب علم کے لئے نئے وقت نکال کر میرے مقالے کی تکمیل کے لئے میری پوری پوری راہنمائی فرماتے۔آپ واقعی ایک ادب دوست انسان ہیں۔اور آپ کے مواد کی بدولت میں اس مقالہ کی تکمیل تک پہنچا۔

شکریہ کے تمام الفاظ اور انداز اِن عظیم ہستیوں کے قدموں میں نچھاور۔۔۔

باب اول

ڈاکٹر بلند اقبال سوانح و شخصیت

ڈاکٹر بلند اقبال سوانح و شخصیت

سوانح و شخصیت

جو لوگ مغربی ممالک میں اُردو زبان و ادب کی سمت و رفتار پر نظر رکھتے ہیں اور خاص طور پر اُردو فکشن کے نشیب و فراز کی کہانی کو سمجھتے ہیں۔ ان کے لیے **بلند اقبال** کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ عمر کی جس منزل میں ابھی بلند اقبال ہیں ادب کے میدان میں نسبتاً جواں سال ادیب کہے جائیں گے۔ لیکن ان کی تحریروں کی پختگی موضوعات کی رنگا رنگی اور انہیں پیش کرنے کے راست اور نرالے انداز کو دیکھ کر کوئی شخص یہ آسانی سے یہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ بلند اقبال جواں سال ادیبوں کے زمرے میں آئیں گے۔

بلند اقبال کی شخصیت کسی ایک دائرے کی اسیر نہیں ہے بلکہ وہ مختلف الجہات کی حیثیت کی حامل ہے۔ ان کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں، مثال کے طور پر اگر پیشہ ورانہ حیثیت سے دیکھا جائے تو وہ میڈیسن کے ڈاکٹر ہیں یعنی سیدھے سادھے لفظوں میں طبیب ہیں۔ طبابت ان کا پیشہ ہے اور وہ جسمانی مریضوں کا علاج کرتے ہیں۔

ادب کے زاویے کے سے ان کی شخصیت کے اندرون میں ایک افسانہ نگار ، ایک فکشن نگار بیٹھا ہوا ہے۔ ٹی وی پروگراموں کی اینکرنگ سے ان کی شخصیت کا ایک اور پہلو روشن اور تابناک ہوتا ہے۔ تعلیمی نقطہ نظر سے وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ ان کے پاس دنیا کے مختلف تعلیمی اداروں سے تعلیم حاصل کرنے کی ڈگریاں موجود ہیں۔ بلند اقبال نے میڈیسن میں ڈاؤ میڈیکل کالج کراچی سے گریجویشن کیا،

پوسٹ گریجویشن کی ڈگری نیو یارک میڈیکل کالج امریکا سے حاصل کی، انہیں اریگن ہیلتھ سائنسز یونیورسٹی امریکا سے فیلو شپ بھی ملی۔ فی الحال بلند اقبال کینیڈا میں میڈیکل اسپیشلسٹ کے طور پر مختلف اسپتالوں سے منسلک ہیں۔

بلند اقبال کی شخصیت کے تعارف کے طور پر ہمارے سامنے ایک مختصر سا مضمون ہے جسے خود بلند اقبال نے ''**میری کہانی**'' کے عنوان سے سپردِ قلم کیا ہے۔ یہاں اسی مضمون کی روشنی میں ان کے مختصر حالات و تعارف تحریر کئے جاتے ہیں۔

بلند اقبال **۷ اپریل ۱۹۶۶ء** کو **حیدرآباد سندھ** کے ایک ایسے گھرانے میں تولد ہوئے جو علمی اور فکری اعتبار سے متمول و مالدار نیز معاشی طور سے متوسط حیثیت کا حامل تھا۔ بلند اقبال کے والد حمایت علی شاعر اُردو دنیا کی ایک اہم ترقی پسند شخصیت رہے ہیں۔ اُن کی والدہ معراج نسیم افسانہ نگاری سے خاصہ شغف رکھتی تھیں اس ادبی اور شعری ماحول نے غیر شعوری طور پر بچپن سے بلند اقبال کو ادب کی راہ کا مسافر بنادیا چنانچہ کم عمری میں یہ ان کا رشتہ اُردو کے بڑے فکشن نگاروں سے استوار ہوگیا۔ ڈاکٹری کی تعلیم کے دوران انہوں نے سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، قراۃالعین حیدر، غلام عباس اور ممتاز مفتی جیسے بڑے بڑے افسانہ نگاروں کو پڑھ لیا تھا۔ اسی دوران ٹالسٹائی اور میکم گورکی کی تحریروں کے تراجم اور فرائڈ کے نفسیاتی تجزیئے بھی لاشعوری طور سے ان کی شخصیت پر اثر انداز ہوتے رہے۔

بلند اقبال کے والد حمایت علی شاعر کی وجہ سے گھر میں ادبی اور معیاری رسائل و جرائد آتے رہتے تھے۔ اور اس طرح سے ان کا ذہنی رشتہ اس دور کے بڑے بڑے صحافیوں اور اہلِ قلم سے خود بخود استوار ہوتا گیا۔ جن اہلِ قلم کو اس

دور میں انھوں سے قریب سے دیکھا اور جانا ان میں احمد ندیم قاسمی، منشا یاد، رشید امجد، سلطان جمیل نسیم خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

بلند اقبال نے اپنے دور طالب علمی میں ہی افسانہ نگاری کی ابتدا کر دی تھی۔ چنانچہ جب ابھی وہ کالج میں زیرِ تعلیم تھے تو منٹو کے افسانے 'چغد' کی طرز پر دس ہزار چغد نام کا ایک افسانہ مزاحیہ انداز میں تخلیق کیا۔ اس کے علاوہ ایک اور افسانچہ 'تمنا' کے نام سے لکھا تھا۔

بلند اقبال آج ایک ادیب اور افسانہ نگار کے طور پر معروف ہو چکے ہیں، نیز پیشہ ورانہ طور پر ان کی شناخت ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے مستحکم ہو چکی ہے۔ لیکن حالات ہمیشہ ایسے نہیں تھے۔ ابتدائی دنوں میں انھیں معاشی الجھنوں سے دوچار ہونا پڑا۔ جب انھوں نے پاکستان سے ایم بی بی ایس کا امتحان پاس کر لیان تو چار پانچ برس شدید معاشی بحران کا شکار رہے۔

اسی دوران یہ خیال جاگزیں ہوا کہ میڈیسن کی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیے بغیر معاشی صورت حال تبدیل نہیں ہو سکے گی۔ چنانچہ انہوں نے پاکستان میں رہتے ہوئے چند امریکی امتحانات پاس کر لیئے۔ اس کے بعد امریکا پہنچ کر نیویارک میڈیکل کالج سے پوسٹ گریجویشن کی ڈگری حاصل کی، ظاہر ہے یہ مشکل وقت تھا لیکن بلند اقبال نے اس مشکل وقت کو بہت خوش اسلوبی سے گزار دیا۔ چنانچہ وہ ''**میری کہانی**'' میں لکھتے ہیں:-

> ''اِس درمیان میں ظاہر ہے خاصا مشکل وقت بھی دیکھنا پڑا اور جو بھی معاشی مسائل ملے، ان سے نبرد آزما بھی ہونا پڑا جن میں نیو یارک اور

شگاگو کی سرد ترین راتوں میں پٹرول پمپ بھرنے سے لے کر اخبار اور بن کباب بیچنے تک کے کام بھی شامل رہے۔ مگر ان سب کاموں نے میری ذہنی بلوغت اور نشوونما میں خاصا کردار ادا کیا"

(ص- ۴۳)

بلند اقبال نے معاشی بحران سے نبرد آزما ہونے کیلئے بہت سی مشکلات کا سامنا کیا اور آخر کار وہ اس مشکل وقت سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن ایک بات جو خاصی اہم ہے وہ یہ ہے کہ مشرقی ممالک میں دورانِ طالب علمی کس بھی طرح کا غیر علمی کام یا جیب خرچ نکالنے کیلئے کوئی بھی کام کرنا خاصا معیوب سمجھا جاتا ہے لیکن اس کے بر عکس مغرب میں اس قسم کو کوئی تصور موجود نہیں، وہ ہر وہ کام کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں جن سے ان کی مشکلات کم ہوں۔ مثال کے طور پر صبح سویرے کالج جانے سے پہلے پہلے ناظرین تک اخبار پہنچا دینا۔ ناشتے کا سامان فراہم کرنا یا اس طرح کا کوئی بھی کام کرنا جس سے چند پیسوں کی آمد ہو جائے کامی اچھا اور مستحسن سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح دیگر اوقات میں مثلاً چھٹی کے بعد یا شام و رات کو کسی بھی ہوٹل میں دو چار گھنٹے کام کرنا، کسی کو ٹیوشن دینا جس سے کچھ اضافی آمدنی ہو جائے معیوب کام نہیں سمجھے جاتے۔

لیکن اس کے بر عکس اگر بلند اقبال اگر اس قسم کے کام کسی مشرقی ملک میں کرتے تو وہ یقیناً ذہنی کوفت کا شکار ہو جاتے اور وہ اس طرح کے کاموں کو کرنے سے پہلے معاشرے اور اپنے فیملی بیک گراؤنڈ کو سو دفعہ دیکھتے لیکن مغربی ممالک میں اس طرح کا کوئی ماحول نہیں ہے وہ ان کاموں کو جو بلند اقبال نے دورانِ طالب علمی

کئے ہیں ہمیشہ استحسان کی نظر سے دیکھا ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ بلند اقبال نے اضافی آمدنی کے لیئے جو کام کیے ہیں انہوں سے سماج اور حالات کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے کیے ہیں جس کی وجہ سے ان کو خاصی آسانیاں دیکھنا پڑیں۔

بلند اقبال ۱۹۹۷ء تا ۲۰۰۰ء تک نیو یارک میڈیکل کالج میں زیرِ تعلیم رہے۔ اس کے بعد امریکن ڈپلومیٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد پورٹ لینڈ اریگن میں رہائش پذیر ہوگئے۔ جہاں انہوں نے میڈیکل کے شعبے میں مزید مہارت حاصل کی۔

بلند اقبال کی شادی اُن کے والد کے ایک قریبی دوست اور عزیز کی بیٹی جن کا نام شجعیہ محمود تھا اُن سے ہوئی جو حیدرآباد سندھ کی رہنے والی تھیں ۔ بلند اقبال ایک شخصیت سے بہت متاثر تھے وہ تھی ان کی والدہ ، کہتے ہیں کہ ہر کامیاب شخص کے پیچھے ایک کامیاب عورت کا ہاتھ ہوتا ہے ۔واقعی یہ بات سچ ہے لیکن اس دفعہ وہ عورت بلند اقبال کی والدہ تھیں جن کی وجہ سے بلند اقبال کو ادب کی دنیا میں شہرت ملی۔

بلند اقبال کی والدہ کو بھی افسانہ نگاری میں کافی شغف حاصل تھا۔ اس لیے بلند اقبال کی ذہنی ہم آہنگی اُن کی والدہ کی وجہ سے سامنے آئی۔ بلند اقبال نے اردو ادب کے اندر جو کچھ بھی تخلیق کیا ہے وہ اصل میں ان کی والدہ کہ موت کا نتیجہ ہے۔ ان کی والدہ کی موت سے قبل بلند اقبال کو تخلیقی عمل سے کوئی خاصی دلچسپی نہیں تھی۔ یہ سچ ہے کہ وہ کتابیں پڑھتے تھے ان کے ذہن میں بہت سے خیالات اور تخلیقات بھی جنم لیتی تھیں لیکن یہ سب کچھ صرف ان کی اندر کی دنیا میں رونما ہو رہا تھا۔

لیکن جب بلند اقبال کی والدہ ایک مہلک بیماری میں اس دنیا فانی سے چل بسیں تو اچانک ان کے اندر کا تخلیق کار بیدار ہوا۔ ان کی والدہ کی موت کا صدمہ شاید ان کی زندگی کا ایک ایسا موڑ تھا یا ان کی زندگی کا ایسا ایک لمحہ تھا جس کی وجہ سے بلند اقبال کی شخصیت فلسفیانہ راہوں پر چل نکلی۔ بلند اقبال اپنی والدہ کی جدائی کے غم کا تجزیہ کچھ اس طرح سے بیان کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے فکری سفر کی ابتداء ہوئی، وہ لکھتے ہیں کہ :-

"۲۰۰۲ء میں شادی کے محض تین یا چار ماہ بعد ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے میری زندگی کے دھارے کو مکمل تبدیل کر دیا۔ اچانک میری والدہ کی طبیعت خراب ہوگئی اور میں انہیں پاکستان سے امریکا اور کینیڈا لے آیا۔ مزید تشخیص سے پتہ چلا کہ انہیں جگر کا سرطان ہے جو بدقسمتی سے اپنی آخری حالت میں ہے اور یہ ابھی اُن کی زندگی محض تین یا چار مہینوں کی ہی مہمان ہے۔ اِن مہینوں میں مجھ سے جو بھی بس میں تھا وہ میں نے کیا مگر بالآخر وہ نومبر کی اکیس تاریخ کو رحلت فرما گئیں۔ والدہ کی طبیعت کی خرابی کے دوران کم و بیش ہر رات میں بے بسی کے آنسو روتا رہا اور میرے اندر ایک کرائسس کا عمل چلتا رہا۔ میں نمازیں پڑھتا تو سجدوں میں خداوند تعالیٰ سے لڑتا تھا اور جب

نمازیں نہیں پڑھتا تو اپنے آپ سے لڑتا تھا۔ ہر صبح میں اُنہیں موت سے اور قریب ہوتے ہوئے اور خود کو زندگی سے دور جاتے ہوئے دیکھتا تھا۔ اس سارے کتھارسس کو میں نے والدہ کی وفات کے بعد لکھنا شروع کر دیا۔ کبھی آزاد نظموں کی صورت تو کبھی مضامین یوں شاید میں اپنے غموں کا مداوا کر رہا تھا۔ مگر وہ ساری تحریریں محض جذباتی گفتگو نہیں تھیں بلکہ اِن میں غیر ارادی طور پر میرا اب تک کا شعور شامل ہو رہا تھا۔ وہ تحریریں کبھی مجھ سے فلسفہ کی صورت نکلتی تھیں تو کبھی ادب کی صورت"

(ص - ۴۴)

بات یہاں تک ختم نہیں ہوتی بلکہ بلند اقبال نے اپنی والدہ کو موت کا صدمہ اپنے اوپر اتنا طاری کر لیا جس کی وجہ سے اُن کے کرب کو اُن کی تحریروں کی مدد سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ بلند اقبال کی جتنی بھی تخلیقی جہات ہیں وہ اُن کو اپنی والدہ کے نام کرتے ہیں اور اُن کی ہی مرہونِ منت ہے کہ بلند اقبال اپنی والدہ سے محبت اور ان کی جدائی کے کرب کو چند جملوں کی مدد سے مزید محسوس کیا جا سکتا ہے۔

بلند اقبال کی والدہ نے ان کی زندگی کی تعمیرِ نو تو کی تھی لیکن رحلت کے بعد بھی اُن کی زندگی کا راستہ متعین کر گئی۔ وہ ایک ایسا دروازہ کھول کر گئیں ہیں جس کا

شاید خود بلند اقبال کو بھی پتہ نہیں تھا۔ جس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ جب اس دروازے پر توجہ دی تو وہ اُن کا سبب بن گیا۔

اردو ادب کی دنیا میں بلند اقبال کا نام کوئی نیا نہیں ہے اس لئے کہ اُن کے افسانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد ہے جو معتبر رسائل و جرائد میں پچھلے پندرہ سالوں کے درمیان اشاعت پذیر ہوئے۔

بلند اقبال بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی زیادہ تر کتابیں افسانوں کے موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ چنانچہ اردو ادب کے اندان کی پہلی کتاب ''فرشتے کے آنسو'' سنہ ۲۰۰۷ء میں دنیائے ادب کراچی سے شائع ہوئی تھی۔ جس میں تیس (۳۰) افسانے شامل تھے۔ اِس کے متعلق بلند اقبال کے اپنے الفاظ ہیں:-

> ''ان افسانوں میں کیا نیا تھا یہ تو خیر تجزیہ نگار ہی بیان کر سکتے ہیں مگر یہ ضرور تھا کہ ان کہانیوں میں ایک سائنسی فکر رکھنے والے نئی دنیا کے شخص کے خواب تھے۔ اس میں بوسیدہ سماجی اور مذہبی رسوم و رواج، فرد اور سوسائٹی کے نفسیاتی مسائل، اخلاقیات کے مصنوعی سماجی معیارات اور مشرقی و مغربی تہذیبوں کے ٹکراؤ سے تخلیق ہونے والے نئے معاشرے کی عمومی مشکل پر کچھ جرأت مندانہ فطری سوالات اُٹھائے گئے تھے جو شاید پڑھنے والے کو متاثر کر کے سوچنے پر آمادہ کر رہے تھے''
>
> (ص- ۴۶)

بلند اقبال کی پہلی کتاب ہی شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگی۔ اس کتاب (فرشتے کے آنسو) کو مختلف ادبی تنظیموں سے ایوارڈ دیے گئے۔ پھر اس کتاب کو اگلے ہی سال جاوید انور کی مدد سے اردو اور ہندی زبان کے اندر شائع ہوئی۔ یہ کتاب پاکستان کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں بھی کافی مقبول ہوئی۔

اس کے علاوہ بلند اقبال کی دو کتابیں **''میری اکیاون کہانیاں''** اور **''سارے ہی محبت نامے میرے''** **۲۰۱۳ء** میں بالترتیب عرشیہ پبلی کیشنز نئی دہلی اور ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی سے شائع ہوئیں۔

پہلی کتاب بہترین اکیاون کہانیوں یعنی افسانوں پر مشتمل ہے۔ اور اسی کتاب کے اندر ''فرشتے کے آنسو'' کی کہانیوں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ جبکہ دوسری کتاب ''سارے ہی محبت نامے میرے'' اس میں مختلف کتابوں پر تبصرے اور ساتھ ہی ادبی شخصیات پر لکھے گئے خطوط اور ساتھ ساتھ تبصرے اور مضامین شامل کئے گئے ہیں۔

بلند اقبال افسانہ نگار اور ناول نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ڈرامہ نگار بھی ہیں۔ بلند اقبال نے تخلیقی ڈراموں پر مشتمل ایک کتاب تصنیف کی ہے۔ جس کا عنوان ہے **''یہی سے اُٹھے گا شورِ محشر''** جو کہ ابھی منزلِ اشاعت میں ہے۔ ڈرامے کی کتاب کے بارے میں خود بلند اقبال لکھتے ہیں:-

> **''اس مجموعے میں شامل ڈرامے مختلف موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں مثلاً گلوبل ورلڈ کے ارتقائی عمل میں کس طرح انسان اپنے نازک رشتے پامال کر رہا ہے اور پھر کس طرح**

قدرت کی بتائی فکر مکافاتِ عمل کی صورت

اِن رشتوں کو استوار کرنے کا اشارہ دیتی ہے''

اس کے علاوہ بلند اقبال ایک نئے اور جدید دور کے ایک منجھے ہوئے ناول نگار بھی ہیں۔ چنانچہ ان کا ایک ناول ''**ٹوٹی ہوئی دیوار**'' جو اُن کا پہلا ناول تھا اور ۲۰۱۶ء میں شائع ہوا تھا۔ متنازعہ علمی موضوع کی وجہ سے خاصا بحث طلب رہا تھا۔ اس ناول کا موضوع اپنے اندر بہت بڑی بحث لیے ہوئے ہے۔ اس کا موضوع وطن اور مذہب کے اس بنیادی تصور پر سوال قائم کرتا ہے کہ آیا یہ تصور تہذیبوں کے ارتقائی عمل کے دوران تربیت پانے والا ایک مصنوعی تصور ہے یا یہ تصور فطری اور اصلی ہے؟

اس کے علاوہ بلند اقبال ٹی وی میڈیا سے بھی منسلک ہیں کیونکہ آپ ایک ہمہ گیر شخصیت کے حامل انسان ہیں اور مختلف ادبی ، سیاسی ، سماجی اور مذہبی موضاعات پر سنجیدہ گفتگو پر مبنی پروگرام ''**پاس ورڈ**'' کے نام سے پیش کرنے لگے انہوں نے ایسے ایسے موضاعات پر مباحثے کا آغاز کیا جس کا تصور پاکستان جیسے روایت پسند معاشرے میں نہیں ملتا۔

انہوں نے ادب کا کام صرف کتاب کے ذریعے ہی نہیں کیا بلکہ انہوں نے دنیا کی برق رفتاری کو سمجھا اور اردو ادب کو ٹی وی شو کے ذریعے دنیا کے بہت سے ممالک کے شائقین تک اپنی آواز اور فکر پہنچانے تک کامیاب ہوئے۔

اس کے علاوہ اُن کے دو اور ٹی وی پروگرام ''**دانائی کی تلاش میں**'' اور ''**دی لائبریری وِد ڈاکٹر بلند اقبال**'' بھی قلمی و ادبی طرز کے پروگرام تھے۔ان پروگراموں کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کو کتابی شکل میں

مرتب کر لیا گیا ہے۔ان کے مشہور اور معروف ٹی وی پروگرام ''**پاس ورڈ**'' جو کہ امریکہ ، کینیڈا کے علاوہ بر صغیر میں نشر کیا جاتا ہے اور کافی مشہور ادبی پروگرام ہے۔ پروفیسر مبارک علی نے اس پروگرام کے چیدہ اور اچھوتے موضوعات کو دو کتابوں شکلوں ''**تاریخ کی چھاؤں میں**'' اور ''**اندازِ بیاں**'' کے نام سے مرتب کیا ہے۔

بلند اقبال ایک پیار کرنے والی شخصیت کا نام ہے اور سرجن ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے شوہر اور اچھے بیٹے بھی ہیں۔ حال ہی میں انہوں نے اپنے والدین کی یاد میں ''**معراج نسیم ورچوئل ہاسپٹل اور حمایت علی شاعر فاؤنڈیشن** کے نام سے ایک ایسے اسپتال کی بنیاد رکھی ہے جس میں ڈاکٹروں کی ٹیم مخصوص اوقات میں آن لائن مفید مشورے دے رہی ہے اور یہ سارے ڈاکٹر اپنے میداں کے ماہر ہیں۔اسپتال کے قیام کا بنیادی مقصد غریب مریضوں کا علاج اور انہیں صحت کے متعلق مزید بیدار کرتا ہے۔ پاکستانی عوام کے ساتھ ساتھ دنیا کے مریضوں کو مفت مشورے دے رہے ہیں اور یہ ایک بہترین اور اپنی نوعیت کا ایک انوکھا کام ہے۔

مغربی دنیا کے ادیبوں کا عام وطیرہ رہا ہے کہ وہ مختلف شعبہ ہائے حیات میں نمایاں خدمات انجام دینے والوں کا انٹرویو کرتے ہیں۔ مشرقی ممالک میں اس کا چلن ہے۔لیکن اس معاملے میں مغربی ممالک کہیں زیادہ دلچسپی اور ذوق سے اس کام کو سرانجام دیتے ہیں۔ چنانچہ مغرب میں آباد اردو زبان و ادب کے جن ادیبوں کے بارے میں ہمیں معلومات حاصل ہوئیں ہیں ان میں اکثریت ایسے ادیبوں اوو دانش وروں کی ہے جنہوں نے مختلف ادیبوں اور دانشوروں سے مکالموں کو کتابی صورت میں یکجا کر دیا ہے۔ خالد سہیل، عاشور کاظمی، تسلیم الٰہی زلفی، جاوید دانش اور اشفاق

حسین جیسے ادیبوں کی خاصی تعداد ہے جنہوں نے انٹرویوز پر مشتمل کتابیں شائع کی ہیں۔

بلند اقبال کا مکالموں پر مشتمل ایک مجموعہ **''کبھی دامن یزداں چاک''** کے عنوان سے اشاعت کی منزل میں ہے۔ یہ دراصل وہ علمی مکالمات ہیں جو انٹرویوز کی صورت میں مختلف ادبی ، سیاسی ، سماجی اور علمی شخصیات سے کیے گئے ہیں۔ان انٹرویوز میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے کہ ان موضاعات کو موضوعِ بحث بنایا جائے جن پر عام طور پر پاکستانی معاشرے میں گفتگو نہیں ہو پاتی یا وہاں کے میڈیا چینل میں ان مباحث کو اپنے موضاعات نہیں بنا سکتے۔

اس نقطہ نظر سے یہ کتاب خاصی دلچسپ ہو سکتی ہے۔ بقول بلند اقبال:-

> **''میری اس کتاب کے پیچھے یہی خیال ہے کہ کسی طرح ہماری نوجوان نسلیں اپنے روایتی فکری حلقوں سے باہر نکلیں اور جدید معاشرتی فکر اور آنے والے سائنسی دور سے ہم کنار ہو جائیں''** (ص-۴۸)

بلند اقبال کا ادبی مطالعہ کافی وسیع ہے۔ انہوں نے مشرق اور مغرب کے رہنے والے لوگوں کا طرزِ زندگی بہت قریب سے دیکھا ہے۔ کیونکہ اُن کی جڑیں مشرقی اقدار اور روایات سے جڑی ہوئی ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے مغربی زندگی کے مسائل اور ان کی پیچیدگیوں کو دل سے قبول کیا۔

بلند اقبال کی کہانیاں ایک سیدھے اور سچے اندازِ بیاں کے سہارے سے آگے بڑھتی ہیں اور اس کے اثرات قاری کے ذہن پر اپنا اثر مرتب کرتی ہیں۔ دنیائے ادب کے اندر بلند اقبال کی جو ادبی قد و قامت اور مرتبے میں اضافہ ہوا ہے

اس کی وجہ ان کی کتابوں کی اشاعت ہے اور ایک منفرد ادیب کے طور پر اُن کی شناخت مستحکم ہوئی ہے۔

بلند اقبال کی کہانیاں کسی مخصوص دائرے کے گرد نہیں گھومتی بلکہ زندگی کے تمام موضاعات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئی ہیں۔اور ان کے افسانوں کی عمارت بہت سارے موضاعات پر قائم ہے۔ان کے افسانوں کا جو بنیادی وصف ہے وہ ہے اختصار نویسی اور اختصار نویسی فکشن کے اندر بہت ہی مشکل کام ہے۔

اس حوالے سے سعادت حسین منٹو کا نام کافی مشہور ہے کیونکہ اُس نے مختصر کہانیوں کی مدد سے ہی زندگی کی اصل حقیقت قاری تک پہنچائی ہے۔ اور یہی بات بلند اقبال کی کہانیوں پر صادق آتی ہے۔ کیونکہ وہ زندگی کو ایک آنکھ سے دیکھ کر دوسری آنکھ سے اس کا فلسفہ براہِ راست پیش کرتے ہیں۔

بلند اقبال کسی خاص مکتبہِ فکر سے منسلک نہیں ۔ اُن کے ہاں اشتراکیت، جدیدیت سے کوئی خاص لگاؤ نہیں بلکہ وہ دونوں فلسفوں کے درمیان سے ایک علیحدہ الگ راستہ تلاش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں جہاں انسان اور انسانیت بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ ہر صورت اپنی کہانیوں میں انسانی زاویوں کو باقی رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بلند اقبال کے موضاعات میں بھی ایک ترقی پسندی پائی جاتی ہے جو روایتی ترقی پسندی سے یکسر مختلف ہے۔اُن کے ہاں انقلاب اور بغاوت سے عاری تحریریں پائی جاتی ہیں۔بلکہ یہ ایک ایسی ترقی پسندی ہے جس میں جدید علوم کی برکتیں اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کی ایجادات و افتراعات کی روشنی شامل ہے۔ان کا اندازِ تحریر انقلابی نہیں ہے بلکہ ہو باغیانہ روش سے گزرتے ہوئے اپنے موضوع کو تازہ ترین

علمی حوالوں سے تقویت بخشتے ہیں۔ اُن کے اکثر افسانوں کے موضاعات یونیک اور عالمگیر قسم کے ہیں اور ان کے موضاعات کا انتخاب میں بھی انفرادیت کی راہ تلاش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر بلند اقبال سے مقالہ نگار کا بذریعہ سوشل میڈیا ٹیلیفونک رابطہ، ۱۱ ستمبر ۲۰۲۲ء۔

۲۔ ''**میری کہانی**'' گوشۂ ڈاکٹر بلند اقبال، کتابی سلسلہ تحریک ادب، وارنسی اتر پردیش انڈیا، مدیر ماہ طلعت، ترتیب و تہذیب جاوید انور ص ۴۲

۳۔ ایضاً ص ۴۳

۴۔ ایضاً ص ۴۴

۵۔ ایضاً ص ۴۵

۶۔ ایضاً ص ۴۶

۷۔ ایضاً ص ۴۷

۸۔ بلند اقبال، ڈاکٹر ''سارے ہی محبت نامے میرے'' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۱۳ء ص ۱۸۷

۹۔ ایضاً ص ۱۸۸

۱۰۔ ایضاً ص ۱۸۹

باب دوم

ڈاکٹر بلند اقبال بطور افسانہ نگار

ڈاکٹر بلند اقبال بطور افسانہ نگار

ہم دیکھتے ہیں کہ اُردو افسانہ نگاری مختلف تجرباتی مراحل طے کرنے کے بعد بالآخر کہانی کی طرف لوٹ آئی اور افسانہ نگاروں کی واپسی اس امر کی دلالت کرتی ہے کہ انہوں نے کہانی پن کی بنیادی اور تاریخی حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے۔ اور اس بات کا اعتراف بر ملا ہو گیا ہے کہ کہانی اور انسان کا رشتہ بہت پرانا ہے۔ یہ جنم جنم کا ساتھ کبھی ختم نہیں ہو سکتا، کہانی انسان سے راز کہتی ہے اور اس کے راز سنتی ہے۔

یوں ایک ہمسفر دوست، ساتھی اور ہمراز کے طور پر کہانی انسان سے وابستہ رہتی ہے۔ کہانی سے تحریریت تک سفر میں افسانہ نگاروں کے کھویا تو شاید کچھ نہیں لیکن حاصل بہت کچھ کیا ہے۔ اس کا اندازہ ہمیں ان کہانی کاروں کو پڑھ کر ہوتا ہے۔ جنہوں نے روزِ اوّل سے ہی کہانی کی بنیادی حیثیت سے اپنا رشتہ استوار رکھا اور وہ رفتہ رفتہ کہانی کو مرحلہ وار جدیدیت سے ہم آہنگ کرتے رہے۔ انہی خوبصورت اور انوکھی کہانیوں میں ایک مجموعہ جو ڈاکٹر بلند اقبال کے قلم سے تخلیق ہوا **''فرشتے کے آنسو''** ہے۔

ڈاکٹر بلند اقبال ایک فزیشن ہونے کے ناطے انہوں نے اپنے مریضوں کی نبض پر اپنی انگلیاں رکھ کر اُن کے مرض کی تشخیص کی اور پھر اُن کے درد کا درماں بھی کیا۔ گویا معاشرے کے نباض مسیحا بن گئے اور یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے ایک کہانی کار کی حیثیت سے اپنے مشاہدے اور تجربے کو بروئے کار لاتے ہوئے اس

میدان میں قدم رکھا تو اِن کہانیوں کو ادبی حلقوں میں بالعموم اور باذوق معاشرے میں بالخصوص بے حد پزیرائی ملی۔

بلند اقبال ایک ایسے قلم کار ہیں جنہوں نے کہانی پن میں طرزِ احساس کو شامل کر کے جدید افسانے کو نئی عطاء کی انہوں نے ایک طرف تو آج کے مشینی تہذیبی پھیلاؤ کو کہانی کا حصہ بنایا اور دوسری طرف کہانی کہنے اور لکھنے کی فطری انداز کو اختیار کر کے روایت اور جدت کا خوبصورت امتزاج پیش کیا اور یہ ثابت کیا کہ کہانی کا دامن ابھی بھی اتنا وسیع ہے کہ اس میں بڑے بڑے موضاعات کو سمیٹا جا سکتا ہے۔

''**فرشتے کے آنسو**'' بلند اقبال کی زندہ کہانیوں کا ایسا مجموعہ ہے جس کو پڑھتے ہوئے ہم خود کو ایک رواں دواں معاشرے میں سانس لیتے محسوس کرتے ہیں ۔ عام فہم مشاہدوں اور زندگی کے عمومی تجربوں سے بڑے نتائج کی دریافت بلند اقبال کی کہانیوں کا بنیادی خاصہ ہے۔

بلند اقبال کی کہانیوں کے کردار بڑے شناسا اور ہماری زندگی کے جیتے جاگتے لوگ ہیں۔ جن کی باتیں ہمیں اپنی توجہ کا مرکز بتاتی ہیں اور ہم ان سے پوری کہانی میں خود محوِ کلام رہتے ہیں یہ وہ مقام ہے جہاں تخلیق اور قاری کے درمیان کوئی دیوار حائل نہیں رہتی اور قاری کہانی کے ساتھ اس طرح پیوست ہو جاتا ہے کہ خود کو اس کہانی کا حصہ سمجھتا ہے۔اور دراصل یہی اچھے تخلیق کار کی کامیابی کی دلیل ہوتی ہے۔

افسانہ نگاری کے میدان میں بلند اقبال قدم قدم پر ایک کامیاب تخلیق کار کے طور پر خود کو تسلیم کرواتے ہیں۔ افسانہ نگاری کے اندر بلند اقبال کا انداز نہایت

سادہ اور بے تکلفانہ ہے۔ سادگئ اظہار کے ساتھ معاشرتی مسائل کو مصور کرنے کا عمل اور فرد کی حیثیت کے لئے فنکارانہ تگ و دو وہ جا بجا دکھائی دیتی ہے۔ بلند اقبال کے موضاعات موجودہ سماج میں گمشدہ فرد کی تلاش اور نئے انسان کے باطنی مسائل کو زیر بحث لاتے ہیں۔

یہ بات سچ ہے کہ بلند اقبال کی کہانیوں میں ہجرت اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل کا پہلو بہت کم ہے۔ اس کی نفسیاتی طور پر ایک وجہ یہ ہے کہ وہ جس معاشرے میں رہ رہے ہیں یعنی مغربی معاشرے میں ہجرت کے مختلف مسائل اُن کی کہانیوں کا موضوع نہ بن سکے لیکن اس کے باوجود بھی اُن کی بعض کہانیاں ایسی ہیں جن میں ہجرت اور مہاجرین اور ان کی نفسیاتی کشمکش کو بلند اقبال نے بھی سمجھنے اور سمجھانے کی پوری کوشش کی ہے۔

اس لئے اُن کا ایک نمائندہ افسانہ ''**اُدھورا کافر**'' اس میں ایک مہاجر کا درد پوشیدہ ہے جو ایک خاص قسم کی ماضی کی کیفیت سے دوچار ہے۔ یہ ایک ایسے فرد کا المیہ ہے جو اپنی شدید ذہانت اور مستحسن فطرت کی بدولت مشرق سے مغرب تک کا سفر طے کرتے ہوئے دنیاوی ترقی کے اعلیٰ ترین منازل پر پہنچ چکا ہے۔ جبران جو اس افسانے کا کلیدی کردار ہے نہایت شاطر اور ذہین لیکن ایک لبرل آدمی تھا۔ وہ حسن و عشق کی منطق کا راہی تھا اور زندگی کے جنسی رازوں اور رویوں سے پردہ اُٹھانا چاہتا تھا۔

جبران نے افسانے میں موجود ایک اور کردار جس کا نام نیلوفر تھا اُس سے شادی کی لیکن جلد ہی وہ اس شادی سے متنفر ہونے لگا۔ ازدواجی زندگی اس کے پاؤں کی زنجیر بننے لگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نیلوفر اور اپنی دو سالہ بچی کو چھوڑ کر

امریکہ میں آباد ہو گیا۔ امریکہ کا آزاد ماحول اسے بہت پسند آیا جہاں ذہنی، معاشی اور جنسی آزادی تھی۔ اس ماحول میں وہ اپنے آپ سے مطمئن نظر آنے لگا اور ترقی کی سیڑھیوں پر چڑھتا گیا۔ ہر قسم کی دنیاوی آسائش ہونے کے باوجود بھی اس کی شخصیت ایک خلا سے بار بار ٹکراتی تھی۔ اُس کی زندگی میں سوائے دولت کے اور کسی چیز کی اہمیت نہیں تھی لیکن پھر بھی ایک کانٹا تھا جو بار بار اس کے دل میں چبھتا رہتا تھا۔ وہ اس کی دو سالہ بیٹی تھی جس کے خیالات ہمیشہ جبران کو کمزور کرتے اور وہ اس کی یاد میں گھنٹوں روتا رہتا تھا۔

اِس کہانی میں اصل میں بلند اقبال نے ایک مہاجر شخص کی زندگی کے المیے کو احساس کی شکل میں پیش کر کے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ انسان خصوصاً مہاجرین جو کسی ناگزیر وجوہات کی طور پر اپنے ملک یعنی مشرقی تصورات کو چھوڑ کر جاتے ہیں لیکن پھر بھی اُن کی زندگی میں ایک خلاء ضرور رہ جاتا ہے جو کانٹا بن کر اُن کی زندگی کو اجیرن بنا دیتا ہے۔ کیونکہ جڑوں سے کٹے ہوئے درخت کی شادابی عارضی ہوتی ہے۔

یہ کہانی اپنے روایات سے باغی اور مغرب کے کامیاب ترین فرد کی ذہنی بلوغت کے المیے کو پیش کرتی ہے جہاں وہ اپنی مغموم بیٹی کے لیے بے چین رہتا ہے۔

افسانہ نگار نے یہاں فرد کے المیے کو واضح کیا ہے۔ اور بیٹی کے تعلق سے اس کی فکر مندی کو مرکز میں رکھا ہے۔ بلند اقبال نے یہ بتانے کی کوئی شعوری کوشش نہیں کی جبران اپنی بیٹی کے مستقبل کی طرف سے پریشان تھا بلکہ وہ اس لیے پریشان تھا کہ وہ اپنی تنہائی کے سانپوں سے تنگ آچکا تھا۔

ہجرت کا کوئی ایک رخ نہیں ہے بلکہ اس کے سینکڑوں رنگ ہیں اور ہر رنگ دوسرے رنگ سے مختلف ہے۔ اُن کی ایک اور کہانی "Pledge of Allegiance" ایک ایسے مغرور بیٹے کی کہانی ہے جو اپنے باپ کے ساتھ ناراض ہو جاتا ہے اور وہ بیرونِ ملک رہائش پزیر ہو جاتا ہے۔ لیکن جب اسے اپنے باپ کی انتقال کی خبر ملتی ہے تو اس وقت کی حالت کو بلند اقبال نے جس طرح اپنے لفظوں کی طرح میں پرویا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ کیونکہ یہ ایک بہترین افسانہ نگار کا ہی کام ہے جو اس قسم کی صورتحال کو لفظوں کے ذریعے قاری کے سامنے اس طرح پیش کرے کہ قاری کے ذہن پر اس کے نقوش موجود رہیں۔

یہ پاکستان میں رہنے والے ایسے شخص کی کہانی ہے جو اپنے باپ سے ناراض ہونے کے بعد امریکا میں رہائش پزیر ہو جاتا ہے۔ یعنی وہاں وہ ہجرت کی زندگی گزارتا ہے۔ لیکن اس کے جانے کے بعد اس کے باپ کا انتقال ہو جاتا ہے۔ جس کی اطلاع اس کا بھائی اسے بذریعہ فون دیتا ہے۔ کیونکہ اسے باپ سے ناراض ہوئے چودہ سال کا عرصہ ہو جاتا ہے۔ اچانک وہ باپ کے انتقال کی خبر سن کر اس کے جو جذبات سامنے آتے ہیں اس پر اس کا جو ردِ عمل ہوتا ہے یہی کہانی کا مرکزی خیال ہے جسے بلند اقبال ایک فنکارانہ طریقے سے اپنے اس افسانے میں پیش کرتے ہیں۔

بلند اقبال کے الفاظ خوابیدہ جذبات کو جھنجھوڑتے ہیں وہ سوئے ہوئے اور مردہ جذبات اور احساسات کو جگاتے اور اُن کو حرکت دینے کے فن سے بخوبی واقف ہیں جن سے زندگی کے جمود پانی میں تموج پیدا ہونے لگتا ہے۔ انہیں دل کے تاروں کو چھیڑنے کا سلیقہ آتا ہے۔

اُن کے فن میں فضا آفرینی ایسی ہے کہ گرد و پیش کے جملہ مظاہر دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں ہر قسم کی آسائش اور ترقی کے باوجود باپ کے انتقال کی خبر سن کر بیٹے کے دل و دماغ میں ایک گہری خاموشی بس جاتی ہے۔ اُس کا اندر کھوکھلا اور ویران ہو چکا تھا۔ اس شاہکار اور جذباتی افسانے ”Pledge of Allegiance“ میں ہر بیٹے کی کہانی موجود ہے جو اپنے باپ سے جدا ہو گیا ہے۔ باپ اور بیٹے کے درمیان جو بظاہر جو تلخ اور نرم و نازک روّیے ہوتے ہیں اُس پر یہ کہانی مشتمل ہے۔ مصنوعی طور پر انسان کے اندر جو مذہب اور وطن پرستی کے جذبات پیدا ہو رہے ہیں ایسی صورتحال پر بھرپور طنزیہ کہانی ہے۔ اس کہانی کے بارے میں بلند اقبال کا نقطہ نظر یوں سامنے آتا ہے:-

> ”اٹھارویں منزل سے آس پاس کی تمام ہی عمارتیں اُسے کھلونوں کی طرح نظر آرہی تھیں مجھے یاد ہے کس قدر خشمگیں نگاہوں مٹھیاں بھینچ کر مجھے دیکھتے ہوئے تو اسکول کے بچوں کو قومی ترانہ یاد کر رہا تھا اور میں شوخ نگاہوں سے تجھے چِڑا رہا تھا۔ ------- میں نے یہی تو کہا تھا نا کہ میں ہر چوبیس گھنٹے کے بعد وفاداری کا یہ گانا نہیں گا سکتا۔----------- ماں سے محبت تو پیٹ سے ہی بچے کے اندر میں اتر آتی ہے پھر یہ ”Pledge of Allegiance“ کی گردان کیوں؟------------- صرف یہی تو میں نے کہا تھا کہ ایمان تو خوں

میں شامل ہوتا ہے پھر ہر چار گھنٹے کے وقفے سے pledge اور repledge کی کیا ضرورت ہے؟ patriotism اور religion دونوں ہی تو فطری عمل ہیں'' (ص - ۵۴)

یہ ایک ایسی کہانی ہے جو صرف باپ اور بیٹے کی مفارقت کے موضوع کے اوپر لکھی گئی ہے۔ خواہ انسان ترقی کی کتنی ہی منزلیں طے کر لے اور اپنا رہن سہن اجنبی زمینوں پر کر لے لیکن جو شدت اور گرمی اپنے خونی رشتوں کے اندر ہے جس سے رشتوں کی گرمی کی وجہ سے دل نرم و گداز رہتا ہے۔ فطری عمل ہے۔ حالات کی وجہ سے اگر دل میں کوئی خلش آ بھی جائے تو وہ دیر پا ثابت نہیں ہوتی۔ کوئی بھی ایک واقعہ زندگی کے نازک لمحے کی بدولت رشتوں کی گرمائیٹ اپنے فطری انداز میں سامنے آتا ہے۔

زبان کا استعمال بلند اقبال کی کہانی میں بے حد فنکارانہ انداز میں استعمال ہوا ہے۔ دلچسپی کے لئے اشارتاً چند معنی خیز جملے یہ ہیں:-

'' تھوڑی ہی دیر میں فیکس مشین سے ایک کاغذ کو دیکھا اور پھر اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ (ص - ۵۵)

اصل میں کہانی کا واقعہ کچھ یوں ہے کہ اُس شخص کا باپ مر گیا اس کا اظہار بلند اقبال یوں کرتے ہیں کہ جب کاغذ زمین پر گرتا ہے تو اس کا ذہن اس روایت کی طرف چلا جاتا ہے کہ شعبان کے مہینے میں ۱۵ تاریخ کو جس جس نام کا پتا درخت سے گرتا ہے تو اس کی زندگی کا سفر ختم ہو جاتا ہے۔ انتقال کی خبر سن کر اس کا دل ڈوب

گیا، آنکھیں مدھم ہو رہی ہیں لیکن مسکراہٹ باقی ہے۔ یہ ایسی مسکراہٹ تھی جس کو پانے کیلئے اُس نے چودہ برس تنہا گزار دیے۔ کہانی کا یہی انداز اسے بے حد حساس اور نرم کہانی بنا دیتا ہے۔

ہزار عیوب تلاش کرنے کے باوجود بھی مہاجرین کی نفسیات کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ نئے ملک میں ہزار عیب دیکھتے ہیں اور ستم ظریفی یہ ہے کہ وہ ملک کو بھی نہیں چھوڑتے۔ اس کا نقصان یوں ہوتا ہے کہ وہ خود کو نئی جگہوں پر ہم آہنگ نہیں کر پاتے اور ہمیشہ اجنبی زندگی گزارتے ہیں۔ اور اس سے ایک نیا پہلو سامنے آتا ہے جسے ہم منافقت کا نام دے سکتے ہیں کہ نئے ملک کیلئے ان کے دلوں میں کوئی عزت و احترام کا جذبہ نہیں ہوتا کیونکہ معاش کی خاطر انہیں وہاں رہنا پڑتا ہے اسی لیے معاشی مجبوری انہیں منافقت کے راستے پر لا کھڑا کرتی ہے۔

اسی قسم کا ایک اور موضوع بلند اقبال کی ایک اور کہانی جس کا عنوان ہے **''بِنا پیندے کے لوٹے''** رپورتاژ کے انداز میں لکھی گئی یہ کہانی ہے۔ کہانی کچھ یوں ہے کہ ایک جہاز پاکستان سے امریکا کی طرف جا رہا تھا۔ اس میں بلند اقبال نے پاکستانی مہاجرین و مسافرین کی ذہنی کیفیات کی عکاسی کچھ اس طرح کی گفتگو کی روشنی میں کی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ پورے کا پورا معاشرہ ہی منافقت کی چادر میں لپٹا ہوا ہے۔

ہمارا معاشرہ گالیاں سب سے زیادہ امریکہ کو دیتا ہے۔ ساری برائیوں کا گھر امریکہ کو سمجھتا ہے لیکن اس کے باوجود امریکی ویزے اور امریکی شہریت کا خواہش مند رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تہذیبی تصادم اور اقتصادی مجبوریوں کی وجہ سے امریکا کے دست نگر سنے کے تضاد سے دوچار رہتا ہے۔

کہانی میں ایک صاحب تبلیغ کے سلسلے میں امریکا کا سفر کر رہے ہیں اُن کا ماننا ہے کہ امریکہ کو ہی رشد و ہدایت کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ ایک اور صاحب جو امریکا کو ہی گالیاں دیے جا رہے ہیں اور کمائی بھی وہیں سے کرتے ہیں۔ان میں سے چند لوگ ایسے بھی ہیں جو مشرقی تہذیب کی تعریف اور اس کی فضیلت کا ذکر کرتے ہیں اور اس کے باوجود امریکا جانے کیلئے سر توڑ کوششیں بھی کرتے ہیں۔

اصل میں اس کہانی کے اندر طنزیہ و مزاحیہ انداز میں ایسے افراد کو نشانہ بنایا گیا ہے جن کے قول و فعل میں تضاد تھا اور منافقت ان کے دل و دماغ کے اندر رچ بس گئی تھی اور مادہ پرستی حاصل کرنا ان کے لئے کوئی عیب نہیں تھا۔ جبکہ مذہب ، دین اور اخلاص ان کے لیے بے معنی اور صرف کتابی الفاظ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

بلند اقبال کی ایک اور کہانی ''**اُبال**'' ایسے کرب کی کہانی ہے جس میں خوشحالی اور ترقی کے خواب ہمیں نہ صرف کچے گھروں سے اٹھا کر غیر ملکوں میں آباد تو کر دیتے ہیں لیکن مشرقی روایات جس میں مشترکہ خاندان کی تہذیب اور سچے خلوص اور پیار کی محرومی کی شکل میں اس کی بھاری قیمت بھی چکانی پڑتی ہے۔

بلند اقبال کی کہانیوں میں جہاں بہت سے مسائل اور موضاعات کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہاں پر خاص طور پر خواتین کے مسائل پر بھی خاصی خاطر خواہ توجہ دی گئی ہے۔ان کی بہت سی کہانیاں خواتین کے بنیادی مسائل کی طرف توجہ مبذول کرواتی ہیں۔ کہیں عورت کے استحصال اور کہیں عورت کی نفسیات کو مرکز بنایا گیا ہے۔

ایک ایسا ہی افسانہ ''**پر اسرار مسکراہٹ**'' جس میں عورت کی نفسیات کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ عورت کی ذہنی کیفیت و کرب کا نقشہ اس افسانے میں اتارا

گیا ہے جو اپنے شوہر سے نفرت کرتی ہے اور یہ حالت مجبوری وہ اس کے ساتھ رہنے پر مجبور ہے۔ ناپسندیدہ چیز سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے عورت کسی بھی حد تک جا سکتی ہے چاہے اس کے لیے اسے اپنی موت کی قیمت ہی کیوں نہ ادا کرنا پڑے۔

افسانے کی کہانی کچھ یوں ہے کہ افسانے کی ہیروئن رقیہ کے خوابوں کا شہزادہ کوئی اور تھا۔ لیکن حقیقت میں اس کے خوابوں کا شہزادہ کوئی اور بن گیا۔ جس کا نام قیوم میاں تھا۔ جو اس کے نازک اور خوبصورت جذبات اور احساسات کو پامال کرتا رہتا تھا۔ جس کی وجہ سے رقیہ شدید الجھن اور بیزاری کا شکار رہتی تھی۔ کیوں ایسے شخص کے ساتھ جنسی تعلقات استوار کرنے سے موت بہتر ہے جسے آپ پسند نہ کرتے ہوں چاہے وہ موت اُسی شخص کے ہاتھوں سے کیوں نہ آئے جسے آپ پسند نہیں کرتے۔

اصل میں اس کہانی کے اندر بلند اقبال نے عورت کی اُس نفسیات کو روشن کیا گیا ہے کہ عورت ناپسندیدہ چیز سے چھٹکارا پانے کیلئے عورت کسی بھی حد تک جا سکتی ہے اس کے لیے وہ جان دے بھی سکتی ہے اور جان لے بھی سکتی ہے۔

اسی طرح کا ایک اور افسانہ جس کے اندر سماجی تناظر میں خواتین کے استحصال اور اس کی مظلومی کی داستان کو بیان کیا گیا ہے **''یدِ بیضا''** ہے۔ اس کہانی کے اندر عورت کی مظلومی کی سیدھی سادھی کہانی کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کہانی کے اندر تلمیحات اور استعارات کا استعمال بہت خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

اس افسانے کی کہانی کچھ یوں ہے کہ موسیٰ زینب کا عاشق ہے اور اس سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ وہ زینب کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھتا ہے۔ زینب اسکی ہے، اس کی طرف کوئی نہ دیکھے، موسیٰ کی بس یہی خواہش ہے۔ لیکن زینب کو موسیٰ کا یہ طریقہ نا

پسند تھا اور وہ ایک آزاد خیال لڑکی تھی۔ لیکن موسیٰ نے طیش اور جذبات میں آکر زینب کے چہرے پر تیزاب پھینک دیا جس سے زینب بدصورت نظر آنے لگی۔ اب زینب کا چہرہ لاکھوں لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گیا اور موسیٰ کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا اور وہ اپنے اس گناہ پر بہت شرمندہ تھا۔

اس کہانی کے اندر بہت سے تلمیحی پہلو موجود ہیں جو عورت کی مظلومیت کی کہانی کو بیان کرتے ہیں۔ موسیٰ تلمیحی پہلو ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف اشارہ ہے کہ موسیٰؑ اللہ پاک کے پیغمبر تھے۔ بچپن میں اُن کا ہاتھ آگ پکڑ لینے کی وجہ سے جل کر سفید ہو گیا تھا۔ اس واقعے کو اللہ تعالیٰ نے معجزے میں تبدیل کر دیا۔ اس کہانی کا اصل اشارہ یہ ہے کہ موسیٰؑ کا جلا ہوا ہاتھ مظلومیت کی علامت ہے۔ لیکن آج کے دور میں موسیٰ ظالم بن گیا ہے۔ موسیٰ اس کہانی میں مرد کے استعارے کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ اور زینب مظلوم عورت کی علامت ہے۔

اس کہانی میں نفسیاتی پہلو یہ ہے کہ موسیٰ زینب کے چہرے پر صرف اس لیے تیزاب پھینکتا ہے کہ زینب میری نہیں تو کسی اور کی بھی نہیں۔ لیکن اس واقعے کے بعد زینب نے لاکھوں لوگوں کی توجہ حاصل کر لی۔ یہی توجہ اصل میں موسیٰ کی شکست تھی۔ اسی شکست کے احساس اور خوف نے اُسے خود کو لوگوں کی بھیڑ کے حوالے کر دیا جس سے وہ سمجھتا ہے کہ تزکیہ نفس ہو جائے۔

بلند اقبال کے بہت سے افسانے غور و فکر کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ کہانی کا انداز اور بیان سیدھا سادا ہوتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس وہ کہانی اپنے اندر بہت سے سوالات کو جنم دیتی ہے اور یہی سوالات کافی غور و فکر کا مطالبہ کرتے ہیں اور قاری کے جذبات کو اندرونی سطح پر زیادہ متاثر کرتے ہیں۔

فیشن اور ترقی کے نام پر بلند اقبال کا ایک اور بہترین نمائندہ افسانہ **''پھٹا ہوا دامن''** فیشن اور لبرل ازم کے نام پر عورت کے استحصال کی کہانی ہے۔ زرینہ جو اس کہانی کا مرکزی کردار ہے اور وہ ماڈلنگ کے شعبے سے تعلق رکھتی ہے اور اس کا ڈریس ڈیزائنر یوسف ہے۔ یوسف ہوس کا پجاری شخص ہے۔ جب ریمپ پر ماڈل ڈریس کی باری باری نمائش کروا رہیں تھیں تو اس موقع کا فائدہ اٹھا کر یوسف زرینہ کے لباس کی چند جھالروں کو مزید کم کر دیتا ہے جس سے زرینہ کا حسن اور جسم مزید قیامت بن کر سامنے آتا ہے۔ پھر ریمپ پر چلتے ہوئے زرینہ کے قدم ڈگمگانے لگتے ہیں اور وہ بے ہوش ہو کر شائقین کے درمیان جا گرتی ہے اور زرینہ اس موقعے پر نفسیاتی طور پر جس طرح سے دوچار ہوتی ہے وہی اس کہانی کا نقطہ ء مرکز ہے:-

''زرینہ کو کیا پتا تھا کہ اچانک یہ ایک چھوٹا سا کڑا لمحہ صدیوں کی تاریخ خود میں سمیٹ کر اُسے زرینہ سے زلیخا میں بدل دے گا۔ اس چھوٹے سے لمحے میں جب زرینہ اوروں کے لئے بے ہوش ہو کر ریمپ سے شائقین میں جا گری تھی اسی لمحے زرینہ زلیخا میں بدل کر بازارِ مصر میں بیچ دی گئی تھی اور یوسف کا دامن پیچھے سے پکڑ کر چیخ رہی تھی کی میں نے تمہارا دامن تو پیچھے سے پھاڑا تھا مگر تم تو نبی تھے نا! دیکھو تُمھاری خود کی خاطر کی گئی جرح سے میرا دامن ہمیشہ کے لیے پیچھے آگے دونوں ہی طرف سے پھٹ گیا ہے'' (ص - ۵٦)

مکمل طور پر یہ ایک تلمیحی کہانی ہے اور تلمیح کے کندھے پر سوار ہو کر عصر حاضر تک پہنچی ہے اور ہم تک پہنچتے پہنچتے فیشن اور لبرل ازم کے پردے میں عورت کے استحصال کا المیہ بن گئی ہے۔ تاریخی طور پر جو اصل قصہ ہے اس کے مطابق یوسفؑ کو بازارِ مصر میں بیچ دیا جاتا ہے اور پھر وہ بِکتا بِکتا عزیزِ مصر کے محل میں پہنچ جاتا ہے جہاں پر زلیخا اس کے عشق میں مبتلا ہو کر اس کا دامن پھاڑ دیتی ہے۔اِس کے بعد پھر مصر کی ساری خوبصورت عورتیں حسنِ یوسف کی تاب نہ لا کر اپنی انگلیاں کٹوا لیتی ہیں۔

لیکن اب جدید دور ہے وقت بدل گیا ہے۔اب بازار اور دربار بدل کی نئی چیزیں آگئیں ہیں۔اب دربار اور بازار کی جگہ ریمپ آگئے ہیں۔ جس میں دربار کی شان و شوکت اور بازار کی رونق اور مستی شامل ہیں۔ زلیخا نے تو تاریخ میں ایک بار یوسف کا دامن چاک کیا تھا وہ بھی پیچھے سے۔ لیکن اب جدید دور کا یوسف ہر روز نئے نئے طریقوں سے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں زلیخاؤں کے دامن آگے پیچھے بلکہ ہر سمت سے چاک کرتا ہے۔

تاریخ میں زلیخا ظالم تھی اور یوسف مظلوم تھا لیکن اب اس دورِ حاضر میں یوسف ظالم ہے اور زلیخا مظلوم ہے۔اس کہانی میں زرینہ ایک استعارہ جو صدیوں سے استحصال کا شکار ہے۔ لیکن دوسری طرف مرد صدیوں سے اپنی حوس کی خاطر مظلوم اور بے بس عورتوں کی عزتوں کو پامال کرتا چلا آرہا ہے مطلب مرد طبقہ زیادہ جارح اور ظالم نظر آتا ہے۔

بلند اقبال کا ایک اور بہترین افسانہ **''نہیں''** ہے۔اس میں ایک شادی شدہ عورت کی نفسیات کے مختلف پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے۔ذہنی طور پر عورت

چاہے جس عمر میں بھی ہو لیکن اس کے اندر کی عورت اور اس کی فطرت ہمیشہ ایک جیسی رہتی ہے۔ اس کہانی کا ایک کردار ''آپا'' جو ایک فرمانبردار اور ہنر مند عورت ہوتی ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ صوم و صلوٰۃ اور شریعت کی پابند عورت ہیں کوئی بھی ایسا کام نہیں کرتیں جو خلافِ شریعت ہو۔ اُن کی شادی کو تقریباً چودہ سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور ان کے خاوند کا نام میاں جی تھا لیکن ان کے ہاں اولاد جیسی نعمت کی کمی تھی۔ آپا جی کی گود ہری نہیں ہوتی تھی۔

ایک دن میاں جی نے حصولِ اولاد کی خاطر دوسری شادی کی خواہش ظاہر کی تو ''آپا'' اتنا زور سے چیخیں کی گھر کے در و دیوار کانپ اُٹھے۔ کیونکہ عورت کی فطرت کے اندر دوسری عورت (سوکن) برداشت کرنے کا جذبہ قدرت نے رکھا ہی نہیں ہے۔ حالانکہ آپا شریعت کے علم سے بخوبی واقف تھیں لیکن پھر بھی وہ اس بات پر آمادہ نہیں تھیں کہ کوئی دوسری عورت ان کی جگہ لے۔

کہانی کے اندر بلند اقبال نے عورت کی فطرت کا یہ نقطہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ عورت کو جس طرح مرضی سے آزمالیں، اس سے جتنا مرضی امتحان لے لیں وہ ہر کسوٹی پر کھری اترے گی لیکن وہ سوکن کا عذاب کبھی بھی برداشت نہیں کر سکتی کیونکہ عورت کی فطرت کے اندر اس بات کو رکھ دیا گیا ہے کہ کسی صورت بھی یہ گوارا نہیں کی اُس کے پیار میں کوئی دوسری عورت شامل ہو، یہ اس کے فطری مزاج کے خلاف ہے۔ عورت چاہے کسی بھی نسل کی ہو، پڑھی لکھی ہو یا ان پڑھ ہو، دین دار ہو یا لبرل، روایتی ہو یا ماڈرن وہ اپنی زندگی کے اندر کسی دوسری عورت کی شراکت کو برداشت نہیں کرتی۔

''نروان'' افسانے کے اندر بھی نفسیاتی مسئلے کو بیان کیا گیا ہے۔ نفسیات اور ہجرت کے اوپر الجھی ہوئی یہ کہانی کئی پیچیدگیوں کو واضح کرتی ہے۔ اس کہانی میں انسان اور اس کی قلب ماہیت کی کہانی کو پیش کیا گیا ہے۔

''نروان'' دو بچوں کی نفسیاتی اور قلب ماہیت کی پیچیدگیوں کی کہانی ہے جو ایک ہی چھت کے نیچے رہتے ہیں۔ نروان کا مطلب ہے نجات۔ ایک ہی چھت اور ایک ہی فضا میں تربیت پانے والے بچے دو الگ الگ منزلوں کے متلاشی ہیں۔ کس قدر مختلف تصور ہے یہ دونوں ہی زندگی کے دو مختلف رازوں کے متلاشی ہیں۔ گزشتہ اٹھارہ سالوں سے مقیم مسز رحمان اور ڈاکٹر رحمان امریکہ میں رہتے ہیں۔

اُن کے دو بچے ہیں۔ لڑکی کا نام موہنی اور لڑکے کا نام شہروز ہے۔ دونوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہوئی ہے لیکن لڑکی ہم جنس پرست ہے اور وہ ہم جنسی کی زندگی گزارنا چاہتی ہے اور ایسا کرنے سے اُسے تسکین حاصل ہوتی ہے اور وہ اسے اپنی تکمیل سمجھتی ہے۔ لیکن دوسری طرف ان کا بیٹا شہروز خالص مذہبی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ اسے امریکا کے سارے سودی نظام اور خلافِ شریعت کاموں کا پتہ ہے۔ اس لیے وہ اس سے چھٹکارا اور نجات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ حالانکہ مسٹر رحمان کے دونوں بچوں نے ایک جیسے ماحول کے اندر تربیت حاصل کی ہے لیکن اس کے باوجود دونوں کی زندگیوں میں فرق ہے۔ حالانکہ دونون کو اپنے فیصلے خود کرنے کی مکمل آزادی حاصل ہے۔

دراصل یہ کہانی انسانی نفسیات کے ساتھ ساتھ مغرب کی مادہ پرست دنیا کی گرہوں کو کھولتی ہے کیونکہ زندگی کبھی بھی سیدھے سادے اور منصوبہ سازی کے ساتھ کئے گئے پروگرام کے تحت نہیں چلتی بلکہ اپنا راستہ خود بناتی ہے۔ یہی وجہ ہے

کہ ایک ہی ماحول میں دو الگ الگ مثالیں سامنے آتی ہیں ۔ ایک طرف انتہائی مادہ پرستی کی مثال اور دوسری طرف روحانیت میں پناہ کی تلاش۔

اجتماعی مسائل کی ترجمانی بلند اقبال کے افسانوں میں خال خال نظر آتی ہے۔ وہ فرد کی ذات کے نہاں خانوں میں ابھرتے ہوئے جذبات کے افسانہ نگار ہیں۔ انفرادی طور سے کسی فرد پر کسی واقعے یا عمل کا اثر کس طرح مرتب ہوتا ہے وہ ڈوبتی ہوئی اثر کی لہروں کو گرفت میں لاتے ہیں۔ وہ اجتماعی طور پر معاشرے کی نفسیاتی ساخت پر اُس کے اثرات سے بحث نہیں کرتے ۔ جیسا کہ پچھلے صفحات میں مذکور ہوا ہے کہ تلمیحی شخصیات و کردار سے وہ نئے نئے خیالات اور غور و فکر کی دنیا آباد کرتے ہیں۔

چوں کہ وہ پیشے کے اعتبار سے ایک طبیب ہیں اس لئے ان کے افسانوں کے اندر طب اور سائنس کی اصطلاحوں سے کافی خاطر خواہ فائدہ اُٹھایا گیا ہے۔ کیونکہ جس شخص کو طب اور سائنس کی دنیا سے آگہی حاصل ہے وہ ہی شخص یہ کام کر سکتا ہے۔ بہت سی کہانیوں کے اندر بلند اقبال کے طبّی اور طبعی طور پر انسان کے مطالعے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرز پر اُن کے دو افسانے ''**میوٹیشن**'' اور ''**آدھا مرد**'' ہیں ۔ جس میں طبعی تبدیلی کے موضع کو برتا گیا ہے۔

افسانہ ''**میوٹیشن**'' کا کردار علی بخش نارمل انسان تھا وہ انتہائی متقی پرہیز گار مذہبی ماحول کا پروردہ اور نیک انسان تھا۔ لیکن اس کا جسم اچانک طبعی تبدیلی سے تبدیل ہونے لگا۔ بے ادبی کی حد تک اس کے جسم کے اعضاء لباس سے باہر نکلنے لگے۔ جدید سائنسی دنیا اور طب کی دنیا میں اس کا جواز تو موجود تھا لیکن مذہبی اور

پرہیزگاری کی دنیا کے اندر یہ تبدیلی کسی عذاب سے کم نہ تھی۔ جس سے اس کی باقی ماندہ زندگی تباہ ہو کر رہ گئی۔ یہ کہانی فرد کے اسی داخلی المیے کا احاطہ کرتی ہے۔

اسی طرح ان کا دوسرا افسانہ **''آدھا مرد''** میں بھی اسی نفسیاتی مسئلے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ شوہر اچانک طبعی احساس کی تبدیلی سے گزرتا ہے اور اپنی بیوی کے کپڑوں اور زیورات میں خود کو سجا سنوار کر خاص قسم کی طمانیت محسوس کرتا ہے۔ مشرقی روایات اور مغربی روایات کی روشنی کے تضاد میں بلند اقبال نے ایک نفسیاتی مسئلے کو اجاگر کیا ہے۔ مشرقی روایات کا فرد جو بظاہر فلسفے اور سائنس کا پرستار دکھائی دیتا ہے پسِ پردہ وہ گناہ و ثواب میں الجھا رہتا ہے۔ جیسے لمبی داڑھی والا مولوی اس کے اندر چھپا ہو۔

افسانہ **''سہاگ رات''** جس کے اندر یہ تضاد موجود ہے کہ شوہر غسل کرنے چلا جاتا ہے اور اپنی بیوی سے کہتا ہے کہ وہ دو رکعت نماز پڑھے اور بتی بھی بجھا دے کیونکہ غسل کرنا واجب ہے۔ دو رکعت نماز سنتِ نبوی ﷺ ہے اور روشنی جلانا مکروہ ہے۔ مذہب اور سماج کے ملاپ کا یہ عجیب سا منظر ہے۔ سائنسی تعلیم اور مذہب کے تضاد کا سلسلہ سامنے آتا رہتا ہے۔ لیکن اس افسانے کے اندر مذہب کا بہت ہی محدود تصور شوہر کے ذہن میں ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود بھی وہ مذہبی لحاظ سے اس کی سوچ ترقی پسندانہ نہیں ہے۔ بلکہ ظاہری رسوم و قیود کی پابند نظر آتی ہے۔ برصغیر کے اندر مذہب چند ظاہری علامتوں میں قید ہو کر رہ گیا ہے۔ اور اس کی اصل روح کہیں اور غائب ہو گئی ہے جس مقصد کے لئے مذہب کا نزول ہوا تھا۔

بلند اقبال کی پیش کش نے موضوع میں گہرائی اور معنویت پیدا کی ہے۔ ایک اقتباس ہے:-

''کچھ ہی دیر میں باتھ روم سے آنے والی پانی کے گرنے کی آوازیں اور اس کی آنکھوں سے بہتا ہوا کاجل اُسے مذاہب کے روحانی اور سماجی ملاپ سے پیدا ہونے والی سہاگ رات کا مطلب سمجھانے لگے'' (ص-۵۷)

دراصل اس کہانی کے اندر پانی کے گرنے کی وجہ سے جو آواز پیدا ہوتی ہے اُس میں مذہب کی روحانیت اور پاکیزگی کی شان پوشیدہ ہے۔ ایک قسم کا ہیجان اور زور پیدا ہوتا ہے۔ جب پانی گرتا ہے اسی طرح جب آنکھوں سے کاجل ارمانوں کے خاک میں ملتا ہے تب وہ خاموشی سے روتے آنسوؤں کے بہنے اور اس کے ساتھ ساتھ درد کا پہلو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ اور یہ سب عناصر مل کر سماجی ملاپ کی علامت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

سہاگ رات نئی نویلی دلہن کے لئے مذہب و سماج کے انہیں متضاد رویوں سے عبارت نظر آتی ہے۔ اس افسانے میں عورت کا یہی کرب اس کو خاص بناتا ہے کہ مذہب کی ظاہر بیں نگاہیں قلبی اور حقیقی جذبات کو آخر کیوں نہیں دیکھ پاتیں۔ جب کہ مذہبی احکام جسم سے زیادہ روح کو پاکیزہ بتاتے ہیں۔

بلند اقبال نے اُن حساس موضاعات کو اپنی قلم کا حصہ بتایا۔ جو دوسرے قلم کاروں حسیات کا حصہ نہیں بن پائے۔ اس بات کو کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا کہ انسانی نفسیات کس قدر پیچیدہ ہوتی ہیں اور اس کے نہاں خانوں میں خواہشوں اور

حسرتوں کے کتنے سانپ پلتے ہیں۔ ایک ایسی عورت کی کہانی جس سے زنا کا مکروہ فعل سرزد ہو گیا اور اس کی پاداش میں اس کو چالیس کوڑوں کی سزا دی جا رہی ہے۔

اس افسانے کی مرکزی کردار **''چاند بی بی''** ہے جو چالیس کوڑوں کی ضرب سے بے حال ہو چکی ہے۔

''کوڑے جو درد سے چیختے تھے''

ایک ایسی کہانی ہے جس میں کوڑوں کے درد کا احساس ہمیں بلند اقبال محسوس کروانا چاہتے ہیں کہ جلاد جو زانیہ کو سزا دینے کے کام پر مامور تھا اچانک سزا دینے کے دوران عورت کو اذیت دیتے دیتے ایک خاص قسم کی جنسی لذت محسوس کرنے لگا۔ اور اُس کی لذت پرستی کا احساس کوڑوں کو بھی ہو گیا اور کوڑے شرمندہ تھے اور احساسِ گناہ کے بوجھ سے دبے جا رہے تھے۔

غرض یہ کہ مختلف احساسات کو الگ الگ سطحوں پر محسوس کر کے بلند اقبال نے حسیات کی ایک نئی دنیا بسائی ہے اور اُن چھپے ہوئے گناہ گاروں کی طرف اشارہ کیا ہے جو ظاہری طور پر نہیں بلکہ طاطنی طور سے زیادہ بڑے مجرم ہیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُردو افسانہ نگاری کے اندر جدت آتی رہی کیونکہ ہر نیا دور اپنے پرانے دور کے لحاظ سے جدید تھا اور وقت کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری کے موضاعات میں بھی تبدیلی آتی رہی۔ بہت سے نئے ایسے موضوعات جب اردو افسانے شامل ہوئے تو ایسا لگ رہا تھا کہ اردو افسانہ نگاری نے اپنی روایت سے بالکل انحراف کر لیا ہے۔ اور لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ بات غلط ثابت ہوئی کہ نئے موضاعات اب نئے نہیں رہے بلکہ یہ بھی روایتی ہیں لیکن ان میں تھوڑی بہت تبدیلی ضرور ہوئی ہے کیونکہ لکھنے والا اپنے ماحول معاشرے اور وقت

کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر لکھتا ہے۔ انہیں موضوعات میں ایک موضوع ہم جنس پرستی ہے جو قاری کے لیے ایک بالکل نیا موضوع تھا۔ اصل میں موضوع وہی پرانا تھا۔ جنس پرستی والا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا ہوتا ہم جنس پرست میں تبدیل ہو گیا۔

ہم جنس پرستی اب اردو افسانے کے لئے کوئی نیا موضوع نہیں رہا بلکہ ایک عام اور کامن موضوع بن چکا ہے۔ عصمت چغتائی کے ''لحاف'' میں بھی ہم جنس پرستی ہی موضوع تھا لیکن اس میں ''گے اور لسبین ازم'' دونوں کو برتا گیا تھا۔

اسی قسم کا ایک افسانہ جو موضوع کے لحاظ سے ہم جنس پرستی پر پورا اترتا ہے ''**یہ کیسی بے وفائی ہے**'' اس افسانے کے اندر نواب صاحب اور بیگم صاحبہ اپنی اپنی الگ الگ دنیاؤں میں مست ہیں۔ اصل میں اس افسانے ''**یہ کیسی بے وفائی ہے**'' کے اندر جو موضوع ہے وہ مردوں کی طرف سے ہم جنس پرستی ہے مطلب بے وفائی مرد کی طرف سے ہے۔ یہ افسانہ اپنی نوعیت کا پہلا افسانہ ہے جس میں اس موضوع کے اوپر لکھا گیا ہے۔ یہاں موضوع (گے ازم) یعنی ایک مرد کا دوسرے مرد کے ساتھ جنسی تعلق اور لذت لیتا ہے۔

کہانی کچھ یوں ہے کہ عفت شادی شدہ خاتوں ہے۔ اس کو سب سے بڑا غم یہ ملا ہے کہ شادی کے دو برس بعد بھی وہ لاولد ہے۔ اُس کا شوہر جو اُسے دل و جاں سے محبت کرتا ہے۔ اُس کی ہر خواہش اور ہر تکمیل کو فوراً پورا کرتا ہے لیکن اس کی اندر ایک خامی ہے کہ وہ ایک جنسی اور نفسیاتی بیماری کا شکار ہے۔ اُس کے بچپن کا ایک دوست تھا شرافت جس کے ساتھ ابھی تک اُس کا جنسی رشتہ قائم تھا۔ پھر ایک

دن اُس کی بیوی اچانک اُن دونوں کو ہم جنس پرستی کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لیتی ہے۔ اور بے ساختہ اُس کے منہ سے نکلتا ہے کہ :-

''یہ کیسی بے وفائی ہے''

اگرچہ ایک فرسودہ موضوع کے اوپر یہ کہانی لکھی گئی ہے لیکن اس کے اثرات میاں بیوی کے رشتوں پر کس طرح پڑتے ہیں۔ عورت کس طرح ذہنی آزار میں مبتلا رہتی ہے۔ اُس کی زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے۔ بلند اقبال نے اِس کیفیت کو اُبھارا ہے۔

بلند اقبال کے افسانوں میں موضاعات کا تنوع ملتا ہے۔ وہ کسی ایک موضو کے اوپر اکتفا نہیں کرتے۔ کیونکہ ایک اچھے افسانہ نگار کی یہی خصوصیت ہے کہ معاشرے میں موجود تمام مسائل اور حالات پر نظر رکھے اور پھر ان حالات اور مسائل کو اپنی فکر کے ذریعے تخلیق کر کے لوگوں تک پہنچائے۔

اسی لیے بلند اقبال کی ایک اور کہانی ''بے زمینی نسل کشی ہے'' میں تہذیبی تصادم اور کش مکش کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار ایسی ماں ہے جس نے اپنا ٹھکانہ ترقی یافتہ دنیا میں بنایا تھا۔ اس کے بچے اسی زمین میں پل کر بڑے ہوئے۔ ماں مشرقی زمین کی پروردہ تھی مغرب کی تاریخ کا چونکہ ماں کو بھی علم نہ تھا اس لئے بچوں کی پرورش اور دینی تربیت میں نئے ملک کی تاریخ و تہذیب کے کردار شامل نہیں ہو سکے۔

جس کی وجہ سے اُن کی شخصیتوں کی نشو و نما بھرپور انداز میں نہیں ہو سکی وہ بچے جذباتی طور سے وہاں کی تہذیب میں گھل مل نہیں سکے۔ برسوں بعد جب ماں

واپس اپنے ملک پاکستان میں آتی ہے۔ تو یہاں کی فضاؤں میں بھی اس کے لیے اجنبیت کا رنگ گھل چکا تھا۔ وہ اب بے زمینی کے آشوب سے دو چار تھی۔

ماں نئے معاشرے میں رچ بس نہ سکی اور اس کی اولاد تھی وہاں برگ و بار نہ لا سکی تب ہو بے چین ہو کر سوچنے پر مجبور ہوتی ہے کہ جس ملک میں اس نے ہجرت کی اُس کی تاریخ و تہذیب کے بارے میں معلومات نہ ہونے اور محض اپنے ملک کی تاریخ و تہذیب سے آشنائی بچوں کو ادھورا انسان بناتی ہے۔ اُس کے ذہن میں ایک ہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ بے زمینی نسل کشی ہے؟

اس کہانی کے اندر افسانہ نگار علامتی انداز میں تاثر دینا چاہتا ہے کہ انسان جس سرزمین کو اپنا وطن بنائے وہاں کی تاریخ و تہذیب کے نقوش سے نہ صرف خود آگہی حاصل کرے بلکہ اپنی اولاد کو بھی واقف کرائے یہ اُن کی شخصیت کی ترقی اور نشو و نما کے لئے ضروری ہے۔

اگر انسان نئے ملک کی تاریخ و تہذیب سے واقفیت رکھتے ہوئے وہاں کی مٹی میں رچ بس جاتے ہیں تو نیا ملک اپنی تمام خوشبوؤں اور رعنائیوں کے ساتھ مہاجروں کو خوش آمدید کہتا ہے۔ جغرافیائی حدیں کوئی معنی نہیں رکھتیں اور نئی زمین ہمارین نسلوں کو اپنے دامن میں سمیٹ کر قوسِ قزح کے رنگ بھر دیتی ہے۔

چونکہ بلند اقبال پیشے سے تو ڈاکٹر ہیں کام ہے خدمتِ خلق۔ بلند اقبال اپنی کہانی ''بو'' میں لکھتے ہیں۔

> ''جس شہر میں لوگ بھیڑوں کے ریشم جیسے بچوں کی کھالوں کو ٹوپیاں اور جیکٹس فیشن کے طور پر

پہنتے ہیں وہاں آنکھوں میں آنسو اور ناکوں میں مرے
ہوئے بچوں کی بو ہی بستی ہے''

یہ آخری جملہ لکھتے لکھتے بلند اقبال، بلند اقبال نہ رہا۔ بلکہ مہاتما بدھ کے سی بھکشو کا چولہ پہن کر کل عالم کو ''اہنسا'' کا پیغام دیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

اس کہانی کی یہی خوبی بلند اقبال کو صفحہ اوّل کے افسانہ نگاروں کی صف میں لا کے کھڑا کر دیتی ہے۔ اور ایسا ہونا بھی چاہیے تھا۔ بلند اقبال منٹو، انور عنایت اللہ، احمد ندیم قاسمی، بیدی اور کرشن چندر کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔ کیونکہ بچپن سے ہی بلند اقبال کے اپنے چھوٹے سے گھر میں بڑی فکر کی اہم ادبی شخصیات کو دیکھا ہے۔ اُن میں فیض احمد فیض، احمد فراز، احمد ندیم قاسمی، رئیس امروہی، جان ایلیا، کشور ناہید، عالیہ امام، صہبا اختر، جمیل الدین عالی، محسن احسان، امجد اسلام امجد، ساقی فاروقی، شبنم رومانی، نگہت بریلوی، سرور بارہ بنکوی، سحر انصاری، پیرزادہ قاسم، محسن بھوپالی، سلیم احمد، حسن حمیدی، شوکت عابدی، مظہر جمیل، آفاق صدیقی، خالد علیگ، اسلم شمیم، جمیل جالبی، منتظر اکبر غرض یہ ہے کی ایک طویل فہرست ہے اُن اہلِ علم و ہنر کی جن کا میں شاید خواب میں بھی نظارہ نہ کر پاتا اگر میں بد نصیبی سے اُس چھوٹے مگر علمی اعتبار سے گنجاں گھر میں پیدا ہونے کی جگہ کسی بڑے مگر فکری طور پر ویران گھرانے میں پیدا ہو جاتا۔

اس چھوٹے سے گھر کی دیواروں پر ٹیگور، لینن، فیض اور مارکس کی تصاویر آویزاں ہوتیں۔ اُس کی فضاء میں ان احباب کی گفتگو کی وجہ سے جدید افکار کے وہ receptors بکھرے ہوئے تھے۔ جو کسی تنگ ترین ذہن کو بھی علمی وسعت نواز کر خاکوں سے باہر سوچنے پر آمادہ کر سکتے ہیں۔

میرے خیال میں اس سارے تر بیتی ماحول نے شخصیت کو وہ بنیاد عطا کر دی جو کسی مخصوص مذہبی، ثقافتی، معاشرتی یا ادبی فکری اسکول کی بجائے اُس سے بالا تر ہو کر سوچنے اور اپنی زندگی کو برتنے کا سبب بنا۔ نور الحسنین نے بلند اقبال کی افسانہ نگاری اور اُن کے موضاعات پر تفصیل سے گفتگو کرتے ہوے کہا کہ :

''اپنی طبعی عمر کا ایک طویل حصہ اور اپنی ادبی عمر کا ایک بڑا حصہ کاٹنے کے بعد میرے سامنے ایک ایسا نوجوان افسانہ نگار آیا جس نے وہ نہیں لکھا جو اس کے ہم عصر لکھ رہے تھے۔اس نے وہ نہیں لکھا جو لوگ پہلے لکھ چکے تھے۔اس نے وہ نہیں لکھا جو سکہ بند ناقدین لکھوانا چاہتے تھے۔وہ اپنی ابتدائی عمر ہی سے اپنی ایک سوچ رکھتا تھا اور اپنے فیصلے خود کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا''

لیکن جب اس نے ادب کے میدان کے اندر قلم اٹھایا تو پورے اعتماد کے ساتھ اپنی بات لکھی اور اپنی فکر اور کرافٹ سے نئی دنیا کو ڈھونڈ نکالا۔ ایک ایسی نئی دنیا جو تھی تو ہمارے ہی اندر لیکن اتنی پوشیدہ تھی کی اس طرف دیکھنے کی کسی نے ہمت ہی نہیں کی۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کونسی دنیا تھی اور اس کے کیا موضاعات تھے۔ جس کے ہاتھ لگتے ہی بلند اقبال کو اعتبار اور امتیاز حاصل ہو گیا؟

سوچنے والے سوچتے رہ گئے کہ ابھی کچھ دن پہلے ہی کی بات ہے کہ یہ لڑکا یا بی بی سیدہ کی دعاؤں کی انگلی تھامے اپنے اطراف کی گمشدہ چیزوں کو تلاش کر رہا تھا کے خبر تھی کی یہی تلاش اُسے اُس دروازے تک پہنچادے گی جو صرف کھل جا سم

سم کا بہانہ ہو گی۔اور اس کے سامنے وہ چہرے آجائیں گے جن کی باطن اُس سے سر گوشیاں کریں گے۔ ہم وہ ہیں جو اپنے آپ سے پہنچے نہیں ہیں۔

بلند اقبال کا طرزِ تحریر نہایت سادہ اور رواں ہے۔ وہ خوبصورت زبان کے اندر لکھتا ہے۔ وہ تکنیک کے تجربوں کی طرف توجہ نہیں دیتا بلکہ مواد اور موضوع پر زیادہ زور دیتا ہے۔اپنے موضوع کو مختصر لیکن بھرپور تاثر کے ساتھ پیش کرنے کا فن اُسے خوب آتا ہے۔اِس کی تحریر میں ایک ایسا رس اور مٹھاس ہے جو قاری کو اپنے سحر کے اندر باندھے رکھتی ہے کیونکہ پیشے کے لحاظ سے وہ ڈاکٹر ہیں۔ اس لئے اس کے افسانوں میں طبّی سائنسی اصطلاحات پوری صحت کے پاس سامنے آتی ہیں۔ قاری کی معلومات میں اضافے کے ساتھ ساتھ وہ ایک نئی معنوی سطح بھی قائم کرتے ہیں۔

بلند اقبال کی کہانیاں درجہ بندی کے لحاظ سے اپنے اندر عنوان کے تحت بہت ساری کہانیاں شامل کرتی ہیں ۔ چوں کہ اُن کے افسانوں کے موضاعات شاہراہِ عام سے ہٹ کر ہوتے ہیں اور ان کے افسانوں میں خارجی پہلو سے زیادہ داخلی پہلو زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں ۔ اُن کے موضاعات میں بہت وسعت ہوتی ہے۔ اُن کی کہانیوں کا کینوس بہت وسیع ہوتا ہے۔ اُن کی کہانیوں میں کچھ نئے نئے قسم کے موضاعات شامل ہوتے رہتے ہیں۔

کسی کہانی میں کچھ اِس طرح کا انداز استعمال کرتے ہوئے خدا سے سوال پوچھتے اور پھر خدا کو اس کی تخلیق پر حقیقت دکھانے کی کوشش کرتے ہیں اس کے علاوہ ان کے موضاعات عالمگیر قسم کے ہوتے ہیں جن میں کہیں وہ دہشت گردی اور امن عالم کے موضوع کو کہانی کے مرکز میں رکھ دیتے ہیں۔

اسی قسم کی ان کی ایک کہانی ہے ''**خدا کا بت**'' جس میں داخلی تصادم اور علامت کی مدد سے طنزیہ انداز میں کہانی کو بیان کیا گیا ہے۔ عام طور پر بلند اقبال کی کہانیوں میں تلمیحی واقعات و شخصیات کی مدد سے اپنی کہانیوں کا پس منظر تیار کرتے ہیں۔ لیکن اس وقت بھی ان کا تخیل نئے زاویوں سے زندگی کے اسرار و رموز سے نئے انداز میں پردہ اُٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر ہم تاریخ کے آئینے میں دیکھیں تو مذہبی تاریخ بتاتی ہے کہ ابراہیمؑ کو بت شکنی کی پاداش میں آگ کے شعلوں کی نذر کیا گیا تھا۔ لیکن بلند اقبال کی کہانی میں آزر خود بت تراش ہے۔ جو زندہ جلا دیا جاتا ہے۔ تاریخی کردار ہونے کے باوجود واقعے کی ترتیب بدلی ہوئی ہوتی ہے۔ بلند اقبال کا یہ خاص انداز ہے کہ وہ کردار تو تاریخی اور تلمیحی منتخب کرتے ہیں لیکن انہیں نئی معنویت اور نئے مفہوم کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔

یہی اس کہانی میں ہوا ہے۔ تاریخی روایات کی روشنی میں آزر معبود تراش تھا۔ وہ خداؤں کا بت بناتا تھا لیکن کائنات کا نیا آزر زندگی کے بت بناتا ہے۔ اس زندگی کے جو بدہیت ہو گئی ہے۔ نتیجتاً اس کے شاہ کاروں سے زندگی کی تلخ حقیقتیں روشن ہوتی ہیں۔

آزر جب کوئی بت بناتا تو وہ کسی اور شکل میں بن کر تیار ہوتا۔ تخیل کی نرمی حقیقت کی سنگلامی کا روپ اختیار کر لیتی۔ چنانچہ ماں کا بت خوف زدہ بچے کی شکل میں اور باپ کا بت دست سوال دراز کیے اشرف المخلوقات کا بت بن گیا۔ انسان بنانے بیٹھا تو جنگلی بھیڑیے کا بت تیار ہو گیا۔ آخر اُس نے خدا کا بت بنانے کا سوچا۔ خدا کو اس نے کبھی دیکھا نہیں تھا۔ خدا اَن دیکھا ہے لیکن تخیل کی مدد سے آزر

نے خدا کا بت بنا ڈالا۔ خدا کا نیا بت بن کر تیار ہوا تو ایسا کمزور بچہ سامنے تھا جو انتہائی لاغر اور ننگا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو اور ہاتھ میں خالی پیالا تھا۔

اس افسانے ہے **''خدا کا بت''** کا مرکزی کردار ابراہیم کا آزر نہیں جو خداؤں کا بت تراش تھا بلکہ یہ موجودہ دور کا آزر ہے جو تہذیب اور سماج کے نئے نئے بت تراشتا ہے۔ جس نے کبھی مذہب کا استحصال کیا، کبھی خدا کو ڈھونڈنے کا دعوٰی کیااور کبھی انسان کو اس مقام پر لا کھڑا کر دیا جہاں پر ہر کوئی دوسرے کا استحصالی بن گیا۔ اس نے عدم مساوات اور ذخیرہ اندوزی کی دیواریں کھڑی کر دیں اور یہی وہ آزر ہے جس نے معصوم بچوں اور نئی نسل کے ہاتھوں میں کشکول تھما دیے یا انہیں دہشت گردی کے راستے کا مسافر بنا دیا۔

افسانہ انسان کے خلاف انسان کے شدید احتجاج کا علامیہ ہے۔ یہ کہانی قدم قدم پر سوالات قائم کرتی ہے۔ کائنات کے بارے میں، خدا کے بارے میں، اس کی تخلیق کے بارے میں۔ کہانی کو آگے بڑھانے میں جن علامتوں سے کام لیا گیا ہے وہ خود طنز کا لباس پہنے ہوئے جلوہ گر ہوئی ہیں۔ اور حیات کی بے اعتباری اور کائنات کی بے یقینی کی غمازی کرتی ہیں۔

ماں جو محبت اور ہمدردی کا استعارہ ہے۔ وہ خوف زدہ بچے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ جو دنیا کی بد نیتی اور اس کے فرسودہ نظام پر طنز ہے۔ باپ سہارے، سائے اور شفقت کی علامت ہے۔ لیکن اب وہ خود محتاج و مجبور ہے۔ انسان جنگلی بھیڑیے کی طرح خون خوار بن گیا ہے۔ اور خدا ایسا بچہ ہے جو لاغر و کمزور ہے۔ شاید یہاں بچے کی شکل میں فطرت کی مجبوری کا استعارہ ہے۔ بچہ ایک نئے پیکر میں

یوں بھی سامنے آتا ہے کہ فطرت اپنی تمام تر مجبوری کے باوجود معصوم بچوں اور غریبوں میں بستی ہے۔

اس کا یہ پہلو بھی نظر میں رہنا چاہیے کہ فطرت جب بچوں میں بستی ہے تو اشرف المخلوقات کو بھی کمزور کے تئیں انسانی رویوں میں ہمدردی کا اظہار کرنا چاہیے۔ غرض یہ کہانی طنز کے رنگ میں کائنات کے تعلق سے سوالات قائم کرتی ہے۔

اسی طرح ایک اور افسانہ ''**شکوہ**'' موضوع کے لحاظ سے نئے زاویے کی کہانی کو بیان کرتا ہے۔ اس میں ایک بوڑھا آرٹسٹ کائنات کے خالق سے تخلیق کائنات کا شکوہ گزار ہے۔ بوڑھا آرٹسٹ آسانی سے ایک تخلیق کو مکمل کر دیتا ہے۔ آڑھی ترچھی لکیروں سے اس کی تخلیق میں جان پڑ گئی۔ تخلیق روشن ہو گئی۔ اس کا ایک ایک پہلو جان دار ہو گیا۔

برش کی مدد سے رنگ آمیزی نے تصویر کو یگانۂ روزگار بنا دیا۔ یہ فن کا کمال ہے لیکن آرٹسٹ کے لئے یہ تصور تکلیف دہ ہے کہ سرِ بازار نیلام ہو کر فروخت ہو۔ یہی تصور اُسے خدا سے شکوہ کرنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ تخلیق تو ایک باریکی ہے اور میں اس کے کرب سے پریشان ہوں۔ خدایا! تیری تخلیق بھی تو کہیں آسانی سے بنائی گئی کوئی تصویر تو نہیں۔ کیا تو نے اپنی تخلیق بار بار بازار میں بکنے کیلئے بنائی تھی؟ یہی ایک سوال اس کہانی کا نقطۂ عروج ہے جو درحقیقت ایک فن کار کے دوسرے بڑے فنکار سے شکوے کے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

ہمیں اس بات کا پتہ ہے کہ بلند اقبال کی تخلیقات کا اصل موضوع انسان اور انسانیت کی خاطر طنزیہ پہلو کو اختیار کیا۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ سب سے بڑے

تخلیق کار کو شاید اپنی تخلیق کے کرب کا احساس نہیں ہے۔ اس لیے اس کی تخلیق کا سلسلہ نہ صرف جاری بلکہ ہر بار اس کی تخلیق استحصال کے کرب سے دو چار ہوتی ہے۔

آرٹسٹ خدا سے سوال کرتا ہے کہ آخر تو نے یہ سب کیا ہی کیوں؟ جب یہ تو جانتا تھا کہ تیری تخلیق کا کیا حشر ہونے والا ہے۔ سب سے بڑے تخلیق کار! تو نے انسان کو اشرف المخلوقات کے درجے پر تو فائز کر دیا لیکن وہی اشرف المخلوق جنسِ بازار بھی بننے پر مجبور کر دی گئی ہے۔ یہ تخلیق کار پر طنز ہے۔

اسی طرح بلند اقبال کی ایک اور کہانی **''انتظار''** ہے جس میں ایک عورت کو موت کا منتظر دکھایا گیا ہے۔ موت کا انتظار کس قدر شدید اور کرب ناک ہو سکتا ہے۔ اس احساس کو بلند اقبال نے محسوس کیا ہے۔ **''میرین''** جو اس کہانی کی مرکزی کردار ہے۔ میرین کو دماغ کا کینسر ہے جو لا علاج بن چکا ہے۔ اب اُسے صرف موت کا انتظار ہے۔ یہ کہانی اسی لمحے اور کیفیت کی کہ بیماری یا بڑھاپے کی وجی سے جب انسان کے سامنے موت کا انتظار کرنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں بچتا تو انتظار کے یہ لمحات کتنے شدید اور کرب ناک ہو سکتے ہیں۔

یہ کہانی اس کا اظہار ہے کہ بیماری جب لا علاج ہو جائے یا بڑھاپے کے آگے موت کے سوا اور کوئی منزل نہ ہو تو دونوں ہی صورتوں میں انتظار کے لمحے کتنے صبر آزما اور ہمت شکن ہو سکتے ہیں۔ کہانی کا اصل کردار میرین اُسے محسوس کر رہی ہے۔ یہ کہانی داخلی طور پر شدید احساسات کی کہانی ہے۔

دورِ حاضر میں جو مسئلہ پوری دنیا کے لئے وبال بن چکا ہے۔ وہ ہے جو دہشت گردی جس کی بہت ساری اقسام ہیں۔ اس قسم میں ایک مذہبی دہشت گردی

ہے۔ مذہب کے نام پر دہشت گردی اور انتہا پسندی کا کھیل پوری دنیا میں جاری ہے۔ اس میں کسی خطۂ ارض کی تخصص نہیں۔ دنیا کا ہر ملک اس انتہا پسندی کا کسی نہ کسی صورت میں شکار ہے۔

بر صغیر بھی اس سے اچھوتا نہیں، خاص طور پر پاکستانی معاشرہ اس طرح کے واقعات کی زد پر زیادہ آیا ہے۔ ان سب حالات کی ذمہ داری بہت سے محکموں اور اداروں کے ساتھ ساتھ اجتماعی طور پر پوری قوم پر عائد ہوتی ہے۔ اس کے لئے پاکستان کے اندرونی مسائل نیز سیاسی تناسب بھی ایک حد تک ذمہ دار ہے۔

اس موضوع کے اوپر بلند اقبال کی ایک اور کہانی **''لال چونا''** ہے۔ بلند اقبال کے افسانے خارجی دنیا سے زیادہ داخلی دنیا میں سفر کرے والے کرداروں سے تیار ہوتے ہیں۔ ان کے کرداروں میں ظاہری طور سے حرکت و عمل کی رفتار واضح نہیں ہوتی۔ مگر ہاں ان کرداروں کا سفر داخلی دنیا میں ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ گویا ان کے اندر حرکت سے زیادہ غور و فکر کا ہیجان بر پا رہتا ہے۔ ہمیشہ ایک داخلی جنگ اور کش مکش چلتی رہتی ہے۔ **''لال چونا''** کی کہانی بھی انہیں جذبات کے ارد گرد بنی گئی ہے۔

کہانی ایک مسجد کے پس منظر میں آگے بڑھتی ہے۔ مسجد جو انسانیت کی فلاح کا مرکز ہے۔ جہاں سے امن عالم، مساوات اور اخوت کا پیغام ساری دنیا میں پہنچتا ہے اور جہاں تزکیۂ نفس کا سبق پڑھایا جات ہے۔ حالات کی ستم ظریفی اور عالمی سیاست کی کارفرمائی کی وجہ سے مسجدیں دہشت اور انتہا پسندی کی علامت بنتی جا رہی ہیں۔ مسجدوں میں انتہا پسندانہ حملے زندگی کا معمول بن چکے ہیں۔ جس سے معصوم جانوں کا ناقابلِ تلافی نقصان بھی ہوتا ہے۔ معصوم بچے بھی اس کی زد میں

آجاتے ہیں۔ جن کے ذہن معصوم ہوتے ہیں اور ان کو یہ بھی پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کس پاداش میں اپنی جان دے رہے ہیں۔ کیونکہ بچے جو کسی بھی معاشرے یا ملک کا مستقبل ہوتے ہیں۔ وہ اس طرح کچل دیے جاتے ہیں کہ کبھی پھر وہ زندگی میں دوبارہ کھل نہیں سکتے۔ در حقیقت اس کہانی میں مسجد کے اسی تبدیل ہوتے کردار کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔

اس کہانی کا مرکزی کردار ''گجی'' ایسا باپ ہے جو اپنے اکلوتے بیٹے کو آبائی پیشے سے ہٹا کر تعلیم حاصل کرنے بھیجتا ہے۔ ''گجی'' جو چونا گچ کا کام کرتا ہے یعنی گھروں، عمارتوں اور مسجدوں کی پتائی اس کا پیشہ ہے۔ دینی اور دنیائی تعلیم سے اس کا بیٹا آراستہ ہو رہا تھا کہ اچانک مسجد میں دہشت گردانہ حملے کی زد میں آکر جاں بحق ہو جاتا ہے۔ اس حادثے کا نفسیاتی اثر اس کے مزدور باپ پر کس انداز سے مرتب ہوتا ہے اسے کے اظہار کے ساتھ افسانہ مکمل تو ہو جاتا ہے لیکن مذہب و مسجد اور اس کے بدلتے کردار کے تعلق سے چند سوالات چھوڑ جاتا ہے۔ یہی سوالات اس کہانی کا بنیادی تاثر ہے۔

معصوم بچے کا باپ خاموش نگاہوں سے خدا سے سوال و احتجاج کرتا ہے:

> ''اُس نے جھک کر اپنے بیٹے کے جسم کو ٹٹولا اور پھر بے اختیار اِس کے منہ کو چومنے لگا۔ گجی نے اپنے اکلوتے بچے کی لاش کو سینے سے لگایا اور دھاڑیں مارتا ہوا مسجد کے صحن میں آگیا اور پھر چیخ چیخ کر آسمان کی طرف دیکھ کر رونے لگا۔ جب اُسے اور کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو بچے کی لاش کو فرش پہ

ڈال کر روتا پیٹتا بھاگتا ہوا چونے کے ڈرم کے پاس آیا۔
اپنے دونوں خون سے لتھڑے ہاتھ چونے کے ڈرم میں
گھمانے لگا پھر کچی اُٹھائی اور روتے ہوئے صحن کی باقی
دیواروں کو لال رنگنے لگا۔ (ص - ۵۸)

اُن کا ایک اور افسانہ ''اندھا فرشتہ'' ہے۔ اِس کہانی میں بلند اقبال نے انسان کی عظمت کا ترانہ گایا ہے۔ فرشتہ اطاعت و فرماں برداری کا پیکر ہے۔ اس کی فطرت میں حکم عدولی اور نافرمانی کے عناصر شامل ہی نہیں ہیں۔ قاسم اور خانم بیگم ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرنے والے لاولد میاں بیوی تھے۔ بیوی کا انتقال ہو گیا جس کے غم میں شوہر اپنی بینائی کھو بیٹھے۔ ایک رات نابینا بوڑھے کے خواب میں خانم بیگم آہی گئیں :-

'' دیکھو نا! مجھے دیکھنے کے لئے تو تمھیں بینائی نہیں
چاہیئے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور سنو جی تمھیں پتا ہے
نا؟ وہاں ساری حوریں بانجھ ہیں۔۔۔۔۔۔۔ میری
طرح اور ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ سارے فرشتے خدا کی
محبت میں اندھے ہیں۔۔۔۔۔ تمھاری طرح''
(ص - ۵۹)

یوں تو کہانی سیدھے سادھے انداز میں محبت کے لافانی جذبے کو بیان کرتی ہے کہ محبت زندگی کی محتاج نہیں بلکہ وہ یاد بن کر زندگی سے چمٹ جاتی ہے۔ لیکن کہانی میں انسان کی عظمت، اس کے اشرف المخلوقات ہونے کا تاثر بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ کہ جنت میں حوریں بانجھ اور فرشتے خدا کی محبت میں اندھے ہیں۔

اِس کا اشارہ یہ بھی ہے کہ انسان اپنی ناقص صورت میں یعنی جب ہو بانجھ ہو یا جب وہ اندھا ہو، حوروں اور فرشتوں جیسا ہو جاتا ہے۔ مکمل بن جائے تو انسان اور ناقص صورت میں حور و فرشتہ بنتا ہے۔ انسان حورو ملائک سے ان معنوں میں بھی افضل ہے کہ اس کے اندر افزائشِ نسل کی قوت بھی رکھی گئی ہے۔ ان معنوں میں وہ تخلیق کی نعمت کا بھی حامل ہے۔ مزید ایک نکتہ یہ نکلتا ہے کہ آسماں اور جنت جس کی آس لیے دنیا میں لوگ زندہ رہتے ہیں۔ وہ بھی نقص سے خالی نہیں۔ بلند اقبال کی یہ کہانی غور و فکر اور پیش کش کے اعتبار سے رجائی لہجے کی حامل ہے۔

امنِ عالم اور مذہب کے کردار پر یوں تو بہت سارے افسانے لکھے گئے ہیں۔ رنگ اور نام بدل بدل کر کس طرح مذہب کا استعمال و استحصال ہوتا آیا ہے۔ اور اس میں مذہب کے پیروکاروں کا کردار کس حد تک ظالمانہ ہوتا ہے۔ انسان کس طرح انسان کے خون کا پیاسا اور اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ بلند اقبال نے اپنے ایک اور افسانے ''**بدلتے چہرے**'' میں اسی سے پردہ اٹھایا ہے۔ چہرے بدلتے رہتے ہیں اور انسان قتل ہوتا رہتا ہے۔ دنیا کی پوری تاریخ اسی طرح کے بے شمار واقعات سے بھری پڑی ہے۔

بلند اقبال شاید یہاں پر ایک غیر مذہبی اور سیکولر سماج کی تشکیل کا خواب دیکھتے ہیں۔ جس میں مذہب کی تبلیغ مذہبی نسلی تعصب اور خدا کی خوشنودی کے نام پر انسانیت کا قتل نہ کیا جائے۔

اس کہانی کا مرکزی کردار محمد عرفان ہے جو ایک تاریخ کا استاد ہے اور تاریخ کی روشنی میں وہ جب عالمی سیاست پر نگاہ ڈالتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ ساری

دنیا میں جنگ زرگری مذہب کے نام پر لڑی جارہی ہے۔ اقتدار کی ہوس میں بھی مذہب کا عنصر شامل ہوتا ہے۔ چنانچہ **''دی گریٹ ری وولٹ کی جنگ ہو''** جس میں موسیٰ کے پیروکاروں نے نصرانیوں کے خون سے موسیٰ کے خدا کا چہرہ لال کردیا تھا۔

مذہب کے نام پر قتل و غارت گری نے خدا کے نام کو بھی خون کی مانند سرخ کردیا تھا۔ تاریخ کے اسی منظر نامے میں فرانس کے گاؤں بے ژُیر میں عیسائی کمانڈر سیمن ڈی ماؤنٹ کا چہرہ ابھرتا ہے۔ جہاں نصرانی مسلمانوں پر ظلم و ستم کا پہاڑ توڑ رہے ہیں۔ منظر نامہ پھر تبدیل ہوتا ہے اب مسجدوں میں اذانوں کے بجائے دھماکوں کی آوازیں آرہی ہیں۔ اور بے گناہ نمازی قتل کا نشانہ بنائے جارہے ہیں۔ وضو خانے کا پانی سرخ ہوگیا ہے۔

اِس بار منظر برما کا ہے جہاں ماتما بدھ کے پیروکاروں نے مسلمانوں کی خانماں بربادی اور مسائل کا لامتناہی سلسلہ شروع کررکھا ہے۔ گویا مذہب کے نام پر نفرت کا کھیل ہمیشہ سے جاری رہا ہے۔ اور تہذیب و ترقی کے تمام تر دعووں کے باوجود خوں ریزی کا سلسلہ جاری ہے۔ دنیا کی تاریخ کے ہر دور میں مذہب کے نام پر خوں ریزی کرنے والے قاتلوں کی داستاں ایک ہے، طریقۂ کار ایک ہے۔ ان کی شکلیں ایک ہیں، فطرت ایک ہے اور مقصد بھی ایک ہے۔ مذاہب کے نام اور چہرے البتہ الگ الگ ہیں یہ سبھی یا تو سفید پوش قاتل ہیں یا نسلی طور سے سفید فام ہیں جن کے دل میں نفرت کی سیاہی اور دانتوں پر تازہ خون کے نشانات ہیں۔

اس کے علاوہ اُن کا ایک اور افسانہ جس کا نام **''الیوژن''** ہے۔ اس کی کہانی بھی عصر حاضر کے ایک بہت نہی نازک مسئلے پر لکھی گئی ہے۔ دہشت گردی

جس نے بہت سارے علاقوں میں اپنے منحوس قدم جمار کھے ہیں اور انسانیت بار بار اس کا نشا نہ بنتی رہی ہے۔

اس کہانی میں مذہبی دہشت گردی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور اس کا سلسلہ تخلیق آدم و حوا اور ان کے دنیا میں بھیجے جانے کا ذکر کرتے ہوئے آج کی دنیا میں دہشت گردی کے مسئلے کو ابھارا گیا ہے کہ کس طرح آدم کو جنت کی بشارت سنا کر اس کی مدد سے اہلِ دنیا کی زندگی کو جہنم زار بنایا جاتا ہے۔ اس کہانی میں آدم (کوئی کردار نہیں بلکہ صرف علامت ہے) جنت کا خواب دیکھ رہا ہے جہاں حوریں اس کی منتظر ہیں۔ فرشتوں کے پروں کی سرسراہٹ ہو رہی ہے۔ ایک رنگین کہکشاں آسمان پر جگمگ جگمگ کر رہی ہے کہ اچانک زور دار دھماکہ ہوتا ہے اور خلقِ خدا خون میں لت پت ہوگئی ہے۔ آہ و فغاں اور بد دعاؤں کا سلسلہ جاری ہے۔

شیطان آج بھی آدم کو گمراہ کرنے کے لئے فریب کاری کی مسلسل تدبیریں کر رہا ہے۔ شیطان پہلے نادیدہ تھا لیکن آج اُس نے تجسیم کا روپ اختیار کر لیا ہے۔ شیطان نے دانۂ گندم کا لالچ دے کر آدم کو ورغلایا تھا اور نتیجتاً دانۂ گندم کی پاداش میں آدم کو جنت سے نکلوانے میں کامیاب ہوا تھا۔ اب وہی شیطان دنیا میں آدم زاد کو حوروں کا لالچ دکھا کر جنت کے خواب دکھاتا ہے اور اُسے خودکش حملوں کے لئے اکساتا ہے۔

آدم زاد شیطان کی عیاری و مکاری کے دام میں گرفتار ہو کر آخر یہ غیر انسانی عمل انجام دیتا ہے۔ یہ اس کہانی کا اہم نکتہ ہے کہ شیطان نے انسان کو پہلے جنت سے نکلوایا اور اب اولادِ آدم کو اِسی فردوسِ گم شدہ کا خواب دکھا کر اس سے اپنا کام نکالنا چاہتا ہے۔

ویسے تو بلند اقبال کی کہانیوں میں کئی رنگ موجود ہیں۔ ان کے افسانوں کا جائزہ کسی ایک زاویے سے کر پانا مشکل کام ہے۔ اِن کی کہانیوں کا کینوس بہت بڑا ہے۔ کہیں سائنسی اور انسانی ترقی کے مسائل ہیں تو کہیں صدیوں کی تاریخ میں لپٹی ہوئی استحصال کی کہانیاں، کہیں ترقی اور روشن خیالی کے باوجود روایتی طرز زندگی کی جکڑ بندیاں ہیں تو کہیں روایت اور تاریخ سے بغاوت کا جذبہ بھی۔

اُن کا ایک افسانہ جس کا نام **''چاند پر موت''** ہے ایک ایسی کہانی ہے جس میں علامتی اندازِ فطرت کے المیے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ نیز انسانوں میں ترقی کی حرص اس قدر بڑھ گئی ہے کہ وہ دھرتی ماں کو بانجھ کرنے سے بھی باز نہیں آتا۔ جس دھرتی ماں کا دودھ پی کر جواں ہوا ہے اس دھرتی ماں کی کوکھ کو بانجھ کر دینے پر تُلا ہوا ہے۔ یہ المیہ دراصل انسانوں کے علاوہ فطرت اور قدرتی مظاہر کا بھی ہے۔ انسانی ترقی کا سیلاب اتنی تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے کہ فطرت بھی اس کے نشانے پر آگئی ہے۔

زمین انسانوں کی ماں ہے وہی اس کی پرورش و پرداخت کرتی ہے۔ لیکن انسان ترقی کی دوڑ میں اندھا ہو کر دھرتی کے سینے کو ہی چاک کر رہا ہے۔ یہ اشارہ ہے معدنیات اور دیگر قدرتی وسائل کے استحصال کا کہ کس طرح انسان اپنی سہولت ،آسائش اور اقتدار کی خاطر زمین کے خزانے پر شب خون مار رہا ہے۔

صنعتی ترقی نے زمین کی زرخیزی کو نہ صرف متاثر کیا ہے بلکہ ہتھیاروں اور جنگلی اقدامات نے زمین میں زہر گھول دیا ہے۔ زمین بنجر ہو رہی ہے اور اس کی آستین کے سانپ اپنا زہر اس کے سینے میں اتار رہے ہیں۔ لاکھوں انسان اس طرح موت کا لقمہ بن گئے ہیں کہ زمین بانجھ ہونے کی خواہش کرنے لگی ہے۔

انسان کی ترقی کا سفر زمین پر ہی مکمل نہیں ہو جاتا بلکہ وہ زمین کو مسخر کرنے کے بعد اب چاند پر اپنی کمندیں ڈال رہا ہے۔ چاند بھی اس تصور سے لہولہان ہو رہا ہے کہ انسان اب اس کے سینے میں بھی آگ اور دھویں کا طوفان اٹھانے والا ہے۔ مشین فیکٹری، فضائی آلودگی اور ہتھیاروں کے کارخانوں کے لئے انسان نے نیا ٹھکانہ تلاش کر لیا ہے۔

بلند اقبال کا ایک اور افسانہ ''بو'' اس کہانی میں انھوں نے دنیا میں انسانی درندگی کے پردے کو فاش کیا ہے۔ پوری دنیا میں جانوروں کی کھالوں کا جو گھناؤنا کاروبار ہے نیز فیشن اور ترقی کے نام پر انسان کی بے حسی جس قدر اپنی انتہا کو پہنچ رہی ہے۔ اس کہانی کو یہ احساس سمیٹتی ہے۔

دین محمد پچیس برسوں سے کھالوں کا سوداگر تھا۔ شہر اور گاؤں کے مختلف مذبحوں سے کھالیں اکٹھا کر کے رنگائی کے لئے شیر زمان کی دکان پر دے آتا۔ ایک دن ایک چھوٹی کھال کی ناگوار بو نے اُس کے دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ کھالوں کی بو ختم نہ ہونے کی شکایت لے کر وہ شیر زمان کی دکان پر پہنچا۔ دروازہ بند تھا۔ اُس نے غصے میں زور سے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ شیر زمان گھٹنوں میں سر دیے بِلک بِلک رو رہا ہے۔ جب دین محمد نے اُسے طعنہ دینا شروع کیا تو شیر زمان کہتا ہے:-

''پگلے! جب بو بہت تیز ہو تو ہو آنکھ کا آنسو بن جاتی ہے۔ تو نے تو صرف بیٹی کی ایک کھال سونگھی تھی۔ میں نے تو اِس کی ساری ہی کھال رنگی تھیں۔ جس شہر میں لوگ بھیڑوں کے ریشم جیسے بچوں کی کھالوں کی ٹوپیاں اور جیکٹس فیشن کے طور پر

پہنتے ہوں وہاں آنکھوں میں آنسو اور ناکوں میں مرے
ہوئے بچوں کی بو ہی بستی ہے'' (ص - ۶۰)

یہ کہانی کا نقطۂ عروج ہے۔ آخری جملے میں کھال کے کاروباریوں کی بے حسی اور انسانی درندگی کا سارا المیہ بیان میں آگیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کہانی کا موضوع اچھوتا اور انوکھا ہے۔

زندہ گوشت اور گرم گرم کھالوں کا کاروبار تو عہدِ قدیم سے پھل پھول رہا ہے۔ لیکن اس جدید دور میں جب انسان نے ترقی کے اعلیٰ مدارج طے کر لئے ہیں۔ تہذیب و تمدن کے بل بوتے پر اس نے ستاروں پر کمندیں ڈال رکھی ہیں۔ چاند بھی اس کی گرفت میں آچکا ہے۔ لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ اس کے ساتھ ہی مروت کے احساس سے انسان دور ہوتا چلا گیا ہے۔

مشینوں کی حکومت دل کی موت بن رہی ہے۔ انسانیت کے زوال کا اشاریہ روز بروز بلند سے بلند تر ہونے لگا ہے۔ اور اشرف المخلوقات رذالت و شقاوت اور بے رحمی کے غار میں دھنستا چلا گیا ہے۔ ذاتی مفادات کاروباری غرض مندی اور منافع خوری کی فطرت نے انسان و حیوان کے فرق کو مٹا دیا ہے۔

اِن کے بعض افسانے تو داخلی زندگی کی مشکلات اور کرب کو ظاہر کرتے ہیں۔ جب کہ بعض افسانوں میں انسان تو کیا فرشتوں کے احساس و جذبات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اِسی نوعیت کا ان کا ایک افسانہ ہے **''فرشتے کے آنسو''** جس میں انسان کی مجبوری کے ساتھ ساتھ فرشتوں کی مجبوری و مقہوری کے درد کو نمایاں کیا گیا ہے۔ یہ کہانی یعنی اس افسانے کے اندر بلند اقبال نے اپنے فن کو انتہا پر

لے جا کر لکھا ہے اور انسانوں کی بیماری نیز تقدیر کے ہاتھوں مجبوری کی داستان بیان کی ہے۔

ایک بیمار لڑکی بے بس نگاہوں سے مکڑی کے جال میں پھنسی ہوئی مکھی کو آہستہ آہستہ مرتے ہوئے دیکھ رہی ہے۔ اور بستر مرگ پر اپنی موت کا انتظار کر رہی ہے۔ اکیس سال تک لڑکی کی نگہداشت اور تیمارداری کرتے کرتے ایک دن اچانک خاموشی سے اس کی ماں اِس دنیا سے چل بسی۔ لڑکی اب ماں اور موت دونوں کا انتظار کر رہی ہے۔

اس افسانے کے اندر اصل میں بلند اقبال انسان کی لاچاری اور قدرت کے ہاتھوں اس کی بے بسی کے المیے کو ابھارا گیا ہے۔ فرشتہ بھی یہ دردناک منظر دیکھتا ہے اور بارگاہِ خداوندی میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے۔

لیکن المیہ یہ ہے کہ تقدیر کا لکھنے والا خاموش ہے۔ اس نے انسان کو زندگی تو بخش دی لیکن اس قدر مصائب میں جکڑی ہوئی ہے کہ فرشتہ بھی اس کی تاب نہ لا سکے۔ فرشتہ جو روزِ اول سے اطاعت و فرماں برداری کا پیکر رہا ہے اسے انسان کی مجبوری نے اس قدر متاثر کر دیا کہ وہ سرنوشت لکھنے کے بجائے رونے لگا۔

سماجی مسئلے کے اوپر بلند اقبال نے سب سے بہترین جو افسانہ لکھا ہے وہ ہے **''شاہ دولہ کے چوہے''** اس میں سماجی مسئلے کے اوپر وہ یہ سوال اس افسانے کے اندر قائم کرتے ہیں کہ کیسے ممکن ہے کہ اکیسویں صدی میں معصوم بچوں کو لوہے کی ایسی ٹوپیاں پہنا دی جائیں جو اُن کے ذہنی نشوونما کو متاثر کریں۔ معصوم بچوں پر یہ ظلم صرف شاہ دولہ تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ ہر سماج، مذہب اور معاشرے میں والدین اندھی عقیدتوں کی ٹوپیاں اپنے بچوں کو پہنا دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے بالغ

ہو کر بھی وہ بچے ذہنی طور پر نا بالغ رہ جاتے ہیں اور اس عمل میں ترقی یافتہ و پس ماندہ ممالک کی کوئی قید نہیں۔ یہ کاروبار ہر ملک میں یکساں سطح پر جاری ہے۔

''وہ اپنا فلسفہ تراشتا ہے۔ زندگی کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اشتراکیت اور جدیدیت سے الگ اپنی راہ بتاتا ہے اور کسی حد تک یہ کہا جا سکتا ہے کہ بلند اقبال کے پاس اگر کوئی ازم یا راستہ ہے تو وہ انسانی زاویہ ہے۔ وہ اپنی ہر کہانی میں اسی زاویے کو برتنے کی کوشش کرتا ہے'' (ص - ۶۱)

نوٹ: شاہ دولہ:

اسمِ گرامی دولہ تھا۔ سلسلۂ نسب بہلول لودھی اور سلسلۂ طریقت بہاءالدین ملتانیؒ سے ہے۔ ابھی بچے ہی تھے کہ کسی ظالم نے اٹھا کر ایک ہندو کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ آپ نے اپنے آقا کی اتنی خدمت کی کہ اس نے خوش ہو کر انہیں آزاد کر دیا۔ آزادی ملنے کے بعد شاہ دولہ نے سرمست سیالکوٹی کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور روحانی نعمتوں سے بہرور ہوئے۔ بڑے فیاض اور سخی تھے جو کچھ آتا راہِ خدا میں خرچ کر ڈالتے۔ سماع سے بڑا شغف تھا۔ لوگ آپ کے بڑے معتقد تھے۔ اور اکثر آپ کے پاس اولاد کی دعا کے لئے حاضر ہوا کرتے تھے۔

مشہور ہے کہ آپ اس شرط پر دعا کرتے تھے کہ جب اس کے ہاں پہلا بچہ پیدا ہو گا تو وہ ان کی خدمت میں دے دیا جائے گا چنانچہ منتیں مرادیں پوری ہو جانے پر والدین اپنا پہلا بچہ شاہ دولے کے ہجرے میں چھوڑ جاتے تھے۔ جن کے

سروں کو ایک لوہے کی ٹوپی پہنا دی جاتی تھی۔ جن سے ان بچوں کی نشو و نما رک جاتی تھی۔ یہ بچے گونگے مخبوط الحواس ہو جاتے تھے اور اُن کے سر چھوٹے رہ جاتے تھے۔

اس لئے ان بچوں کو **''شاہ دولہ کے چوہے''** کہا جاتا ہے۔ شاہ دولہ کا انتقال ۱۰۷۵ء میں ہوا اور مزار گجرات میں ہے۔ تاہم نو سو برس گزر جانے کے باوجود ضعف اعتقاد رکھنے والے والدین آج بھی اپنا پہلا بچہ شاہ دولہ کے مزار کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ (اُردو انسائیکلو پیڈیا - فیروز سنز کراچی صفحہ ۸۸۲)

بلند اقبال کا ایک اور افسانہ **''شرک''** ہے۔ جس میں بلند اقبال نے عورتوں پر استحصال جو صدیوں سے ہوتا ہوا آرہا ہے اس کی طرف توجہ مبذول کروائی ہے۔ عورت جو ازل سے ظلم کا شکار رہی ہے۔ کس طرح مرد حکمران معاشرے میں گھُٹ گھُٹ کر زندگی گزارنے پر مجبور ہوتی ہے۔ کیونکہ عورت ایک ایسا کردار ہے جو ہمیشہ سے مظلوم رہی ہے۔

بقول سعادت حسن منٹو کہ :-

''ہم ایسے معاشرے میں رہتے ہیں جہاں مرد صرف غسل کر کے پاک ہو جاتا ہے اور عورت کو اپنی پاکی ثابت کرنے کے لئے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے''

کیونکہ محبت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، کوئی نسل نہیں ہوتی، کوئی سرحد نہیں ہوتی، محبت کوئی ذات پات کو خاطر میں نہیں لاتی کیونکہ سب سے بڑا مذہب انسان ہے اور انسانیت ہے۔ سب سے بڑا مذہب محبت ہے، امن ہے آشتی ہے۔

بلند اقبال اپنے اس افسانے **''شرک''** میں یوں بیان کرتے ہیں :-

''کم بخت ! شرک کرتی ہے۔ ہندو سے بیاہ کرتی ہے اور کہتی ہے محبت تو خود خدا ہے۔ محبت تو خود خدا ہے''

اصل میں بلند اقبال مذہب کے اُن نام نہاد ٹھیکے داروں پر طنز کرتے ہیں جن کو اصل میں مذہب کی تعلیمات کا سرے سے پتہ نہیں ہے۔ وہ مذہب کا غلط استعمال کر کے اپنی دوکان چمکاتے ہیں ۔ اور مذہب کے نام سے انسانی جان کو اپنی جاہلیت کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ اسی قسم کی درد ناک کیفیت اس کہانی کے اندر ملتی ہے :-

''ننگا کر کے مارو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ زندہ گاڑ دو۔۔۔۔۔۔کتیا کو جلا دو۔۔۔۔۔۔۔اپنے ہندو عاشق سے ملادو۔۔۔۔۔۔۔۔۔''

یہ سب کچھ کرنے کے بعد وہ سمجھتے ہیں کہ اُنہوں نے دین کا حق ادا کر دیا۔ اب وہ خدا کے ہاں بہت نیک اور معزز انسان بن گئے ہیں ۔ لیکن حقیقت میں شیطان نے ان کے ذہنوں کو مفلوج کر کے اپنے قبضے میں کر رکھا ہے۔ ہو جن کاموں میں خدا کی خوشنودی سمجھتے ہیں۔

اصل میں وہی کام خدا کے نزدیک سب سے بُرے اور غلیظ ترین کام ہیں۔ کسی بھی انسان کی نا جائز جان لینا؛ خدا اور مذہب میں پوری انسانیت کی جان لینے کے مترادف ہے۔ اور کسی ایک انسان کی جان بچانا پوری انسانیت کی جان بچانے کے مترادف ہے۔

اسلام کے اندر تو انسانی جان کی اتنی اہمیت ہے کہ اگر خانہ کعبہ یعنی خدا کے گھر کے اندر کوئی انسان پھنس جائے تو حکم یہ ہے کہ خانہ کعبہ کو شہید کر کے گرادو اور اس میں موجود انسان کو بچالو۔

جب اسلام اور مذہب کے اندر انسانی جان کی اتنی اہمیت ہے تو پھر کیوں انسانی جان کو مچھر اور مکھی سے حقیر تر جان کر کچل دیا جاتا ہے۔ اصل میں بلند اقبال اسی نقطے کی طرف توجہ مبذول کروانا چاہتے ہیں۔

بلند اقبال کے پہلے افسانوی مجموعے **''فرشتے کے آنسو''** کا پہلا افسانہ پہلی کہانی جس کا عنوان ہے **''یا بی بی سیّدہ''** اصل میں کوئی افسانہ یا کہانی نہیں ہے بلکہ حقیقت پر مبنی اُن کے دل کی آواز ہے جو انہوں نے ایک ایسی ہستی کی محبت میں آکر لفظوں کی شکل میں ادا کئے ہیں جن کی وجہ سے وہ واقعی بلند سے بلند ہو گئے اور آج وہ جس مقام اور مرتبے پر ہیں وہ واقعی انہیں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔

اس کہانی کے اندر اصل میں وہ اپنی کہانی بیان کرتے ہیں ۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ کہانی کم اور آپ بیتی زیادہ ہے۔ کیونکہ یہ حقیقت پر مبنی الفاظ کی شکل میں ہے۔ اس کے اندر سب سے پہلے بلند اقبال نے زندگی کی حقیقت بینا کی ہے کہ ہر ذی روح جو اس دنیا میں آیا ہے اُس کو مخصوص دورانیے کے بعد جانا ہے۔ اس دنیا میں مستقل کوئی رہنے نہیں آیا۔ اسی طرح انسان کا دماغ بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بلوغت کا ارتقائی سفر کرتا ہے۔ اسی طرح کی کچھ تبدیلی میرے ذہن کے اندر ہونے لگی۔ میں نے بچپن کے اندر ہی اپنی امی سے پوچھا کہ :-

''میں سوچتا رہتا ہوں پر سوچ نہیں آتی''

اِس کے بعد میری امی کا جو جواب تھا وہی اصل میں میری زندگی کا اصل مقصد تھا جسے اُس وقت تو نہ سمجھ سکا لیکن وقت گزرنے کے بعد مجھے وہ سمجھ میں آنے لگا کہ :-

''بیٹا! خوب پڑھنا اور پھر غور کرنا، اُس کے بعد ہی سوچنے پر سوچ آئے گی''

اور جب بھی میں ان جملوں کی بالیدگی پر غور کرتا ہوں تو اِک اِک کر کے زندگی کے سارے پردے پورے معنوں کے ساتھ میرے سامنے سے گرنے لگتے ہیں۔

اس کہانی میں بلند اقبال جو اصل نقطہ سمجھانا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ اس دنیا میں جو آیا ہے اُس کو جانا ہے۔ لیکن اس کے بر عکس دنیا میں اکثر کچھ چیزیں کھو جانے کے بعد مل جاتی ہیں۔ مجھے بھی بھولنے کی عادت تھی۔ اور میں سارا گھر سر پر اُٹھا لیتا اور پریشان ہو جاتا۔ میری امی جب بھی مجھے اس حال میں دیکھتیں تو کہتیں۔۔۔۔

بیٹے دل میں کہو۔۔۔۔۔۔۔۔

''حضرت بی بی سیدہ۔۔۔۔۔۔سلام کروں گا چودہ میری کھوئی ہوئی چیز کر دو پیدا''

تو وہ چیز مجھے ضرور مل جاتی

لیکن جب سے میری امی کھوئی ہیں۔ میں نے ہر لمحے حضرت بی بی سیدہ یہی دعا کی ہے۔ لیکن کچھ چیزیں ایسی نایاب ہوتی ہیں کہ جب وہ کھو جائیں تو واپس نہیں ملتیں بلکہ اُن کی جگہ جنت ہوتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ بلند اقبال، ڈاکٹر ''فرشتے کے آنسو'' دنیائے ادب، کراچی ۲۰۰۷ء - ص ۵۴

۲۔ ایضاً ص ۵۵

۳۔ ایضاً ص ۵۶

۴۔ ایضاً ص ۵۷

۵۔ ایضاً ص ۵۸

۶۔ ایضاً ص ۵۹

۷۔ بلند اقبال، ڈاکٹر ''میری اکیاون کہانیاں'' عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی ۲۰۱۲ء - ص ۲۰

۸۔ ایضاً ص ۶۱

۹۔ ایضاً ص ۶۴

۱۰۔ ایضاً ص ۶۹

باب سوم

ڈاکٹر بلند اقبال بطور ناول نگار

ڈاکٹر بلند اقبال بطور ناول نگار

بلند اقبال کا شمار دورِ جدید کے **ممتاز** اور نامور ادیبوں میں ہوتا ہے۔ وہ بیک وقت ایک اچھے افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین اور نئے ابھرتے ہوئے ناول نگار بھی ہیں۔اُن کے ناولوں کا اندازِ تحریر ایک منفرد آہنگ فلسفیانہ انداز اوراور اچھوتے اسلوب کی وجہ سے اردو ادب میں ایک جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں ۔ اُن کی تحریروں کا موضوع انسانی تہذیب طرزِ معاشرت حقوقِ نسواں ، نفسیاتی مسائل ، جنسی مسائل ، تہذیبی تصادم اور علمی و فکری عوامل ہیں۔

اِن کے ناولوں میں تمام فنی و فکری لوازمات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اِن کے ناولوں کے اندر سماجی ثقافتی اور تاریخی روایات کا گہرا اثر دیکھنے کو ملتا ہے۔ چنانچہ ناول نگاری کے میدان میں اب تک بلند اقبال کے دو بہترین ناول منظرِ عام پر آئے ہیں اور اُردو ادب کی زینت بنے ہیں۔

اُن کا پہلا ناول ''**ٹوٹی ہوئی دیوار**'' ہے۔ یہ ناول سنہ ۲۰۱۶ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی سے شائع ہوا ہے۔ یہ ناول ''**ٹوٹی ہوئی دیوار**'' متنازعہ علمی موضوع کی وجہ سے خاصا بحث طلب رہا ہے۔اِس ناول کا موضوع وطن اور مذہب کے اس بنیادی تصور پر سوال قائم کرتا ہے کہ آیا یہ تصور تہذیبوں کے ارتقائی عمل کے دوران پانے والا ایک مصنوعی تصور ہے یا یہ تصور فطری اور اصلی ہے ؟

اس کے علاوہ بلند اقبال کا دوسرا ناول ''**کھوئے ہوئے صفحات**'' ہے جو حال ہی میں ۲۰۲۲ء میں ارشیہ پبلی کیشن دہلی انڈیا اور سانجھ پبلی کیشن لاہور

پاکستان سے شائع ہوا ہے۔ جو ایک جرمن عورت کی کہانی بیان کرتا ہے جو نازی جرمنی کے مظالم کا شکار ہو کر پاکستان میں پناہ گزین ہونے پر مجبور ہوتی ہے۔

لیکن یہ صرف ایک عورت کی آپ بیتی ہی نہیں ہے بلکہ ایک پورے زمانے کی کہانی ہے جس میں کروڑوں لوگ رنگ، نسل، عقیدے اور دیگر تعصبات کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ کہانی آج بھی جاری ہے۔ ہمارے ارد گرد لوگ آج بھی ان ہی تعصبات کی بنیاد پر اِسی طرح کے ظلم و تشدد اور نا انصافی کا شکار ہو رہے ہیں۔

بلند اقبال کے ان دو عظیم ناولوں کو تفصیل سے زیرِ بحث لانے سے پہلے ہم تھوڑا سا ماضی کے اندر سفر کرتے ہوئے اُردو ادب میں ناول کا آغاز اور اس کی ابتدائی نشوونما کے حوالے سے جانتے ہیں کہ اردو ادب کے اندر کن حالات اور زاویوں سے اس صنف نے قدم رکھا ہے۔ اور اب اس صنف نے اپنے قدم جما لیے ہیں۔ اور اب یہ صنف اردو ادب میں ایک خاص اہمیت کی حامل ہونے کے ساتھ ساتھ بہت بڑا ذخیرہ ادب اپنے اندر لئے ہوا ہے۔

انیسویں صدی کے آخر میں اردو قصہ نگاری کی روایت ناول نگاری کی منزل میں داخل ہوئی یعنی اردو ناول نے ایک باقاعدہ صنف ادب کی حیثیت سے جنم لیا۔ اگر ہم غور سے مطالعہ کریں تو ہمیں ایک بات کا بخوبی پتہ چلتا ہے کہ انیسویں صدی کے نصف اوّل میں جو قصے کہانیوں کی بے شمار کتب ہمیں ملتی ہیں وہ مختلف افسانوی اسالیب کے تحت لکھی گئیں ہیں کے اثرات بھی زیادہ منظم طریقے پر ہندوستان میں داخل ہوئے اور اُس وقت کے نامور ادباء جن میں سر سید، آزاد، مولانا حالی، نذیر احمد اور اُس وقت کے دوسرے نامور دانشوروں کی شعوری

کوششوں سے اُردو ادب نے انگریزی ادب کے بہت سے موضاعات اور اُن کے اسلوب کو اپنے اندر سمو لیا۔

اور انہی رجحانات کی وجہ سے اِس کے اثرات اردو اصناف جس میں نظم اور نثر پر پڑنے لگے۔ انہیں اصناف اور رجحان میں ناول نگاری کا رجحان بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اُردو ادب کے اندر ناول کے آغاز کا یہ ایک پس منظر اور پہلو تھا اور اس رجحان اور صنف کی رہبری اُس زمانے کے اندر سر سید احمد خاں اور اُن کے رفقاء کر رہے تھے۔

پس اردو ادب کے اندر ناول جو انیسویں صدی میں اپنی ابتدائی شکل میں انگریزی ادب کے اثرات کی وجہ سے نمودار ہوا۔ اور پھر اِس نے وقت کے ساتھ ساتھ اور حالات کی سنگینیوں کی وجہ سے اپنے اندر بہت سے موضاعات کو لیتے ہوئے منازل طے کرتے ہوئے قدیم دور سے جدید دور میں داخل ہوا۔ اور ناول کے اندر تقریباً زندگی سے متعلق ہر موضوع نے جگہ بنالی ہے۔

شاید ہی کوئی ایسا موضوع بچ گیا ہو جو ناول کے اندر اپنی جگہ بنانے میں رہ گیا ہو۔ وقت اور زمانے کے ساتھ قدیم مشرقی و مغربی دور سے جدید مشرقی و مغربی دور تک ہر زمانے میں ناول نے بہت سے موضاعات کو نہ صرف اپنے اندر سمویا بلکہ اُن کو مقبولِ عام بھی کیا۔

ٹوٹی ہوئی دیوار کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ

اب ہم بلند اقبال کے مشہورِ زمانہ ناول ''**ٹوٹی ہوئی دیوار**'' کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ کرتے ہیں۔ ''**ٹوٹی ہوئی دیوار**'' بلند اقبال کا بہترین ناول ہے جس کی ضخامت تقریباً پونے دو سو صفحات ہے۔ اِس ناول پر ہندوستان کے مشہور قلم کار **نورالحسنین** نے پیش لفظ تحریر کیا ہے۔ اپنے پیش لفظ میں نورالحسنین ناول کے بارے میں رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :-

> ''**اِسے اُردو کا پہلا ناول قرار دیا جا سکتا ہے کہ یہ مشرقی اقدار اور مغرب کے بدلتی ہوئی فکر اور گلوبلائزیشن کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ماحول کی عکاسی کرتا ہے میرا خیال ہے کہ یہ ناول اپنے وقت سے کم از کم پچاس یا ساٹھ برس آگے کا نقشہ پیش کر رہا ہے**''

اچھے ناول نگار کی یہی خوبی ہوتی ہے کہ وہ ناول کے شروع سے ہی قاری کو اپنی گرفت میں لے لے۔ اور قاری ناول کو ایک ہی نشست میں پڑھ کر اِس سحر سے نکلے۔ یہی بلند اقبال بلند اقبال کے اندر بھی پائی جاتی ہے اُن کا ناول ''**ٹوٹی ہوئی دیوار**'' کی شروعات بھی ایسی ہی سحر انگیز ہے کہ پہلی ہی لائن سے قاری ناول کے ساتھ جڑ جاتا ہے اور جیسے جیسے وہ آگے بڑھتا ہے تو اس کا تجسس اور بڑھتا چلا جاتا ہے۔ بلند اقبال نے اِس ناول کو اِس طرح سے تین مناظر میں ترتیب دیا ہے کہ جیسے

قاری ناول نہیں پڑھ رہا بلکہ کوئی فلم دیکھ رہا ہے۔ اور مناظر وقفے وقفے سے اُس کی آنکھوں کے سامنے تبدیل ہو رہے ہیں۔

اور ان مناظر کو انہوں نے اس طرح ترتیب دیا ہے کہ ایک سین ہمیں پاکستان (کراچی) اور دوسرے ہی لمحے وہ افغانستان جیسے ملک میں جہاں دہائیوں سے جنگ جاری ہے اور پھر اِس کے بعد سین کینیڈا جیسے ترقی یافتہ ملک میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اِس طرح اِن مناظر کو بلند اقبال نے اپنے اس ناول میں ۱۳۰ ابواب میں مکمل کیا ہے۔

اس ناول کے پہلے ہی باب کی پہلی لائن قاری کو اپنے سحر میں اس طرح جکڑتی ہے

"پکڑ پکڑ سالے کو،۔۔۔۔۔۔ذلیل کتا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ہمارے نبی ﷺ کے لئے بکتا ہے۔ جرأت کیسے ہوئی اِس مردود حرامی کو۔۔۔۔

یہ ناول ایک ایسے حادثے سے شروع ہوتا ہے جہاں سفید لباس میں ملبوس ایک شخص کو پیغمبرِ اسلام کی شان میں گستاخی کا مجرم (بلا تفہیم) کہ کر بیچ چوراہے پر زندہ جلا دیا جاتا ہے۔ اس کام کو انجام دینے والا شخص ادریس ہے جس کے کام سے خوش ہو کر مذہبی راہنما اور ٹھیکے دار اِسے انعام واکرام سے نوازتے ہیں۔

یہ سارا واقعہ ادریس کا بیٹا عثمان ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کے پیچھے سے چھپ کر دیکھتا رہتا ہے۔ اصل میں بلند اقبال نے **"ٹوٹی ہوئی دیوار"** کی علامت بوسیدہ اور خستہ حال روایات کے طور پر استعمال کی ہے۔ جس کے پیچھے سے نئی نسل خوف اور دہشت میں مبتلاء ہو معصوم نظروں سے مستقبل کا سرا تلاش کر رہی ہے۔ ادریس کے

بچے (عثمان) کی نفسیات پر اس حادثے کا اس قدر گہرا اثر مرتب ہوتا ہے کہ وہ ہر چیز سے خوف زدہ ہونے لگتا ہے۔ اسے اپنے باپ ادریس سے اتنی وحشت ہو جاتی ہے کہ اس پر نظر پڑتے ہی اُس کو دورے پڑنے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ دورہ اتنا شدید ہوتا ہے کہ اِس پر کوئی دوا کارگر نہیں ہوتی۔

عثمان ابھی معصوم ہے۔ اس کے دل و دماغ پر مذہبی تنازعات، مسلکی اختلافات اور رنگ و نسل کے امتیازات کی لکیریں بہت واضح نہیں ہیں۔ اِس لئے یہ تمام مناظر و واقعات اس کی روح کو خوف میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ رفتہ رفتہ وہ ذہنی مریض بن جاتا ہے۔ یہ ان معنوں میں ملک کے ارباب حل و عقد کے لئے ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ جہاں مستقبل کے معمار ذہنی مریض بن جائیں۔

ادریس جو پہلے ایک معمولی، بے روزگار، لا اُبالی اور غیر ذمہ دار شخص تھا۔ اِس واقعے کے بعد اِس کی زندگی میں دولت کی فراوانی ہو جاتی ہے۔ مولوی سلیم اللہ نہ صرف اُس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں کہ اس نے بہت نیک کام کیا ہے۔ بلکہ اُسے مدرسے کے کام پر بھی لگا دیتے ہیں۔ کہانی سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ مذہب کے ٹھیکے دار مذہب کے نام پر جذباتی اور بے روزگار نوجوانوں کو دام فریب میں الجھا کر اُن سے ایسے سارے کام کراتے ہیں جن سے سماج میں انتشار اور انارکی کا ماحول بنا رہے۔

اسی کہانی کا دوسرا منظر جو افغانستان جیسے جنگ زدہ سماج سے جڑا ہوا ہے۔ جہاں پر پروفیسر واحدی ہے جو بیس برس سے پہلے مذہبی تشدد کا شکار ہوا تھا۔ اور نتیجے میں اپنی محبوبہ اور والدین کو کھو چکا تھا۔ پروفیسر واحدی کے ذہن میں گلوبل ورلڈ کا خواب سجا ہوا ہے۔ وہ ایک دنیا کی تعمیر کا خواب دیکھتا ہے جہاں انسان رنگ، نسل،

مذہب اور زبان کو بھول کر ایک دوسرے سے پیار کرنے لگیں۔ واحدی کی اس کوشش کو ناکام کرنے کے لیے اُسے ڈرایا دھمکایا جاتا ہے۔ اس پر حملہ بھی ہوتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود پروفیسر واحدی نا اُمید اور مایوس نہیں ہوتا۔

پروفیسر واحدی کے علاوہ ایک اہم کردار واحدی کا ایک روشن خیال دوست ناظر عزیزی ہے۔ عزیزی اور واحدی کے درمیان کا مکالمہ بلند اقبال کے فلسفۂ حیات کو بہت واضح لفظوں میں بیان کر دیتا ہے۔ ناظر عزیزی اور پروفیسر واحدی کے درمیاں کا مکالمہ ملاحظہ فرمایئے:-

عزیزی نے ہنستے ہوئے کہا: ''اچھا تو تمھارے خیال میں ضرورت ایجاد کی ماں ہے؟''

''ہاں اور اقتصادیات باپ ہے اور جس کی بہت ساری بیویاں ہیں۔ اِن میں سے جو سب سے زیادہ خوبصورت ہے اُس کا نام مذہب ہے۔ اِس کی دوسری بیوی کا نام قومیت ہے۔ تیسری زبان اور چوتھی رسوم و رواج۔۔۔۔۔۔۔

اب جسے چاہے وہ بازار میں لے آئے اِس کا کوئی دین ایمان تھوڑا ہی ہے''۔ یہ کہہ کر ہنستے ہوئے واحدی اپنی کرسی سے اُٹھ گیا۔(ٹوٹی ہوئی دیوار۔ ص ۴۸)

اس کے علاوہ اِس ناول میں دو کردار اور بھی ہیں جس میں ایک پاکستانی احمدی لڑکی ثانیہ جو کینیڈا کی شہری ہے اور اِس کے ہندوستانی بوائے فرینڈ دلیپ جو کینیڈا میں میڈیکل سائنس کا طالب علم ہے کی محبت کے سہارے کہانی آگے بڑھتی

ہے۔ ثانیہ جو کہ ایک احمدی مسلک سے تعلق رکھتی ہے اور دلیپ مذہب کے اعتبار سے سکھ مذہب کا پیروکار ہے۔ ثانیہ ایک بہت ہی باشعور کردار کے روپ میں سامنے آتی ہے۔ دلیپ ایک ذہین اور باشعور فرد ہے ایک طرح سے دیکھا جائے تو یہ پروفیسر واحدی کے گلوبل ورلڈ کی نمائندگی کرنے والے فرد ہیں۔ جہاں تعلیم نے لوگوں کو اتنا باشعور بنا دیا ہے کہ وہ اچھے برے کا فیصلہ کرنے کے لئے آزاد ہیں۔ اِس کے ساتھ ہی اِن کی پشت پر اِس ملک کا قانون موجود ہے جو ہمہ وقت اِن کی حفاظت کرتا رہتا ہے۔

پاکستانی سماج میں مذہبی اجارہ داری اور تشدد کا پہلو بہت واضح طور سے نظر آتا ہے۔ ادریس جیسے جذباتی اور کم خواندہ شخص کو مذہب کے نام پر تشدد کرنے کے لئے اُکسایا جاتا ہے۔ اِس کے مجرمانہ عمل کو نیکی اور ثواب کا نام دے کر حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ نتیجے کے طور پر سماج میں انتشار اور بکھراؤ کی صورت پیدا ہوتی رہتی ہے۔ یہ کام کرنے کرانے والے اِس بات سے بالکل بے نیاز رہتے ہیں کہ اِن کے اس اقدام کا اثر آئندہ نسلوں پر کس طرح مرتب ہوگا!

ادریس کا بیٹا عثمان اِس نئی نسل کی نمائندگی کر رہا ہے جو درحقیقت مستقبل کے پاکستان کا معمار بننے والا ہے۔ اس ناول میں افغانستان بھی ہے جو چالیس برسوں سے جنگ، تشدد، خانہ جنگی اور مذہبی شدت پسندی کی ضرب برداشت کر رہا ہے۔ طالبان ایک عرصے سے ملک کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں۔ نیز بدلتی اور آگے بڑھتی ہوئی زندگی کے شانہ بشانہ چلنے سے خود کو مجبور پاتے ہیں۔

ناول نگار نے اس نکتے کو فن کاری اور باریکی سے بیان کیا ہے۔ اس دہشت زدہ ماحول میں بھی بعض افراد ایسے ہیں جو امن کے خواب دیکھ رہے ہیں اور

مستقبل کی روشنی سے قطعاً مایوس نہیں ہیں۔ اس ناول کے اندر پروفیسر واحدی کا کردار ایک ایسے فرد کا ہے جو حال سے مایوس نہیں بلکہ مستقبل سے پر اُمید ہے۔

اِس ناول میں بلند اقبال نے تین ممالک کے سماجی پسِ منظر سے کام لیتے ہوئے مسائل کی نشان دہی کی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ناول نگار کے ہاتھوں میں کیمرا ہے اور اُسے گھما گھما کر قاری کو سارے مناظر اِس طرح دکھاتا جاتا ہے کہ پورا معاشرہ خوبیوں اور خامیوں سمیت دکھائی دینے لگا ہے۔ سماج کی عکاسی میں بلند اقبال نے جزئیات نگاری سے کام لیا ہے۔ کرداروں کی نفسیات اور داخلی کیفیت کو بیان کرنے میں انہوں نے مہارت کا ثبوت دیا ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ کہانی ایک ٹریجڈی سے شروع ہوئی تھی اور ایک دوسرے المیے پر اختتام پذیر ہوئی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ناول کی ابتداء میں گستاخِ رسول کے موضوع پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ناول کے اختتام پر قادیانی مذہب کے سنّیں معاشرے میں موجود نفرت کے ماحول کو پیش کیا گیا ہے۔

ٹوٹی ہوئی دیوار کو بلند اقبال نے ایک استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ٹوٹی ہوئی دیوار روایات کی وہ بوسیدہ دیوار ہے جو کہ حالات کے بے رحم تھپیڑوں کی وجہ سے خستہ حال ہو چکی ہے اور اس خستہ حال دیوار کے سوراخ کی اوٹ میں سہمی سہمی اور خوف زدہ نظروں سے وہ معصوم نگاہیں جھانک رہیں ہیں جنہوں نے مستقبل کا بوجھ ابھی اپنے کندھوں پر اٹھانا ہے۔ اس سہمی ہوئی اور ڈری ہوئی نگاہ کا نمائندہ اِس ناول کے مطابق ادریس کا بیٹا ننھا عثمان ہے۔

ننھا عثمان جو کہ ابھی بہت چھوٹا ہے اور اِس کے دل کی چھوٹی سی سلیٹ پر ابھی نفرت، مذہبی منافرت شیعہ ، سنی اور احمدی فرقوں جیسی تفریق کی شبیہ بھی

نہیں ابھری مگر اِس ننھی سی عمر میں وہ اپنے باپ ادریس کو ایک ایسے شخص پر تشدد حتیٰ کہ جلاتے ہوئے بھی دیکھتا ہے جس پر فقط الزام تھا کہ وہ گستاخ رسول ہے۔ اس سارے وحشت ناک منظر کا اثر ننھے سے دماغ پر بہت برا پڑتا ہے اور وہ کم عمری میں ہی ایک طرح سے ذہنی مریض بن جاتا ہے۔

اِس ناول کے دوسرے دو اہم کردار ایک یونیورسٹی کا ایک روشن خیال پروفیسر واحدی ہے اور دوسرا کردار نوجوان نسل کی بیدار مغز طالبہ ثانیہ کا ہے۔

پروفیسر واحدی اور ثانیہ کے درمیان لیپ ٹاپ پر ہونے والی چیٹ معاشرے میں پیدا ہونے والی تفریق، چاہے اس کا تعلق مذہب سے ہو، فرقہ سے ہو، سیاست سے ہو یا معاشرتی رسوم و رواج سے ہو یا پھر محبت کی شادی سے ہو، بڑے ہی کمال کے ڈائیلاگ ہیں۔ اِس میں وہ تمام تر باتیں ڈائیلاگ کی گئی ہیں جو کہ ترقی پذیر اور پسماندہ ملکوں میں شجرۂ ممنوعہ کا درجہ اختیار کر چکی ہے۔

ناول کے تیسرے دو اہم کردار جو کہ ثانیہ اور دلیپ کے درمیان ایک محبت کی صورت میں پروان چڑھتے ہیں۔ ثانیہ ایک احمدی قادیانی جبکہ دلیپ ایک سکھ ہے مگر محبت ان سب نفرتوں کی لکیروں کے درمیان مذہب اور ذات پات کا نظام اور والدین کی دقیانوسی والی سوچ رکاوٹ بنتی ہے مگر یہ نئی نسل کے پڑھے لکھے اور باشعور نمائندے روایات کی اُن بے نام دیواروں کو گرا کر ایک ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔

اپنے اپنے والدین کی اناؤں کی وجہ سے جب ثانیہ اپنا مذہب چھوڑ کر سکھ ہونے کا اور دلیپ اپنا مذہب چھوڑ کر احمدی ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں تو اِس موقع پر ثانیہ بہت ہی خوبصورت انداز میں کچھ یوں اظہار کرتی ہے:-

''محبت اپنی ذات میں بڑی خود غرض ہوتی ہے اور میں تمھاری غرض میں مبتلا ہوں۔ تم ہندو، عیسائی، سکھ ہو یا مسلمان مجھے جب تم سے محبت ہوئی تھی تو میں نے رامائن کا پاٹ یا قرآن کی آیت میں تمھیں نہیں پایا تھا۔ تمھارا مذہب سکھ اور میرا اسلام تھا مگر دونوں کے رب کے آخری منزل محبت تھی۔ نسل اور مذہب جسموں سے گزر کر جب روح تک پہنچتے ہیں تو وہ کچھ نہیں بچتے صرف محبت بن جاتے ہیں''

چوتھے اہم کردار پروفیسر واحدی اور اُس کا روشن خیال دوست ناظر عزیزی ہے۔ ناظر عزیزی ہنستے ہوئے پروفیسر واحدی سے ایک سوال پوچھتا ہے جس کے جواب میں واحدی کہتا ہے کہ :-

''ضرورت ایجاد کی ماں ہے بالکل اسی طرح اقتصادیات باپ ہے اوراس کی بہت ساری بیویاں ہیں۔ اِن میں سے جو سب سے زیادہ خوبصورت ہے اُس کا نام مذہب ہے۔ اِس کی دوسری بیوی کا نام قومیت ہے۔ تیسری بیوی زبان اور چوتھی بیوی رسم و رواج ہے۔ اب جسے چاہے وہ بازار میں لے آئے اِس کا کوئی دین ایمان تھوڑا ہی ہے''

اِس ناول کا ایک اور کردار پروفیسر واحدی اور اِس کی بیوی صوفیہ ہے۔ اِن دونوں کا پیار بھی روایات کی بھینٹ چڑھ کر ناکام ہو جاتا ہے۔ اِن دونوں کی محبت کے درمیان بھی مذہبیت کی آہنی دیوار آڑے آتی ہے۔ اِس ناول میں پروفیسر واحدی کا کردار بہت ہی اہم ہے جو کہ ایک وقت میں کئی محاذوں پر لڑتا ہے اور بیدار مغز کا یہ المیہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے سامنے ہونے والی ظلم و زیادتی پر خاموش نہیں رہ سکتا۔ اِن روایتی دیواروں کو مسمار کرنے کے لئے پروفیسر واحدی پنی کلاس کے طلباء میں بصیرت کی روشنی پھیلانے کی بھرپور کوشش کرتا ہے۔

بلند اقبال کا یہ ناول ایک ایسا آئینہ ہے جس میں تمام معاشرتی تفریقوں کا عکس واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اِس ناول میں ڈائیلاگ میں جو زبان استعمال کی گئی ہے۔ وہ بہت ہی سیدھی اور صاف ہے۔ اس ناول کے اندر وہ سب کچھ موجود ہے جس کی ہماری آج کی نسل کو پڑھنے کی بہت ضرورت ہے کیوں کہ اِس ناول کے پہلے ہی صفحہ پر لکھا ہے۔

''اپنے خوابوں کے نام''

''ایک ایسی دنیا جہاں رنگ، نسل اور مذہب کا فرق نہ ہو''

پس ہم آخر میں اِس ناول کے بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ اِس پورے ناول کا ایک ایک صفحہ اِس یک جہتی اِس Equality کے خوابوں سے رنگین ہے پھر چاہے وہ ادریس ہو جو مذہب کے نام پر خون کی ہولی کھیل رہا ہو اور یہی خون اِس کے اپنے دامن تک پہنچ جاتا ہے جب اس کا اپنا بچہ عثمان اسے ایک تخریب کار سمجھ کے خوفزدہ ہو کر اِس سے بہت دور ہو جاتا ہے گو کہ وہ مذہب کے کاروبار میں ڈھیروں منافع کمار ہا ہے۔

یا پھر پروفیسر واحدی جو رنگ نسل قومیت اور مذہب سے ہٹ کر ایک خوشحال زندگی کو paint کرنا چاہتا ہے۔ جس کا کینوس اِس کے طالب علموں کا ذہن ہے۔ ثانیہ اور دلیپ ہوں کہ جو دو مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے کے باوجود ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور ایک ہو جانے کے فیصلے سے بیحد مطمئن اور خوش و خرم نظر آتے ہیں۔ اس ناول کے اندر امید بھی ہے آنے والی نسلوں کے لئے اور ان گنت سوال بھی اور یہ سوال وہ ہیں جو اپنی آنے والی نسلوں کے تعلق سے ہم سب کے ذہنوں میں اُٹھتے رہتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ یہ ناول آخر وقت تک قاری کو جکڑ کے رکھتا ہے اور جب تک اسے پورا نہ پڑھ لے اسے رکھ نہ پائے گا۔

''ٹوٹی ہوئی دیوار'' اس ناول کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لینے کے بعد اب اس ناول کا فنی جائزہ لیتے ہیں۔

بعض نقادوں کا خیال ہے کہ ڈاکٹر بلند اقبال نے وقت کی کمی کے باعث ناول کی نئی ہیئت ایجاد کی ہے۔ افسانے کی حد تک تو مختصر نویسی ٹھیک تھی مگر ناول کے اندر افسانے جیسی اختصار نویسی واقعی بلند اقبال کی ایک بہت بڑی کامیابی ہے۔ یہ ناول لکھتے وقت بھی بلند اقبال نے اپنی مختصر نویسی کا فن استعمال کیا اور دریا کو کوزے میں بند کیا اور یہ ناول انہوں نے (۱۷۶) ایک سو چھہتر صفحات میں انتہائی مہارت سے سمو دیا۔ اور اِس ناول کے اندر بلند اقبال نے نئے تکنیکی تجربات کیے جو ہمارے اس معروف دور میں نئے لکھنے والوں کے لئے ایک مکمل راہنمائی ہے۔

منظر نگاری کا فن اس ناول میں صادق نظر آتا ہے۔ قاری کو ایسا لگتا ہے ہے جیسے وہ خود وہاں کھڑا سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ ناول اسلامی دہشت پسندی اور فرقہ

وارانہ نفرت کی مختلف پرتوں کو ایک ایک کر کے کھولتا ہے۔ اس کے اسباب سے بھی پردہ اٹھاتا ہے اور نتائج بھی دکھاتا ہے۔

''ٹوٹی ہوئی دیوار'' میں جو منظر دکھائے گئے ہیں وہ پاکستان کے ہر شہر میں بلکہ ہر گلی محلے میں رونما ہوئے۔ کس طرح دیکھتے ہی لوگ خدا، رسول اور فرقہ وارانہ عقائد کے نام پر جنون اور دشمنی کے راستے پر چل نکلے۔ کس طرح اسلام کے نام پر مسلمانوں نے ایک دوسرے کا لہو بہایا۔ صدیوں سے ایک ہی شہر ایک ہی محلے میں رہنے والے لوگ اچانک ایک دوسرے کے لئے اجنبی اور دشمن بن گئے۔ یہ جنون کسی وائرس کسی وباء کی طرح پھیلتا چلا گیا۔ اس ناول **''ٹوٹی ہوئی دیوار''** کے بارے میں نورالحسنین اورنگ آباد (دکن) والے بہت ہی خوبصورت انداز میں تجزیہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:

> ''ٹوٹی ہوئی دیوار'' بلند اقبال کا پہلا ناول ہے اور موضوعی اعتبار سے بھی اسے اردو کا پہلا ناول قرار دیا جا سکتا ہے کہ یہ مشرقی اقدار اور مغرب کے بدلتی ہوئی فکر اور گلوبلائزیشن کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ماحول کی عکاسی کرتا ہے میرا خیال ہے کہ یہ ناول اپنے وقت سے کم از کم پچاس یا ساٹھ برس آگے کا نقشہ پیش کر رہا ہے کیونکہ مشرقی ممالک کا ارتقائی سفر بہت دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہے''۔

اِس ناول میں پاکستان، افغانستان، کینیڈا اور ہندوستان کے افراد ہیں۔ پاکستان جو ایک اسلامی ملک کہلانا پسند کرتا ہے۔ لیکن جس طرح وہاں مسلکی مسائل اور شدت پسندی دکھائی دیتی ہے۔ اس کے سبب نفرتیں جنم لے رہی ہیں اور ہر مسلک کا حامی اپنے آپ کو جنتی اور دوسرے کو کافر اور جہنمی سمجھتا ہے اور مذہب کی آڑ میں کچھ افراد جس طرح سیاسی مفاد پرستانہ کھیل کھیل رہے ہیں۔ اُن کے باعث عام انسان پر کیا بیت رہی ہے یہ سب پر عیاں ہے۔

افغانستان کئی برسوں سے جنگ کا عذاب جھیل رہا ہے۔ اور مغربی ممالک اپنی اقتصادی، معاشی پالیسیوں کو کامیاب بنانے کی خاطر امن کے نام پر جو چال چل رہے ہیں۔ دنیا اس سے بھی خوب واقف ہے۔ روس کی بالادستی کو ختم کرنے کے لئے ہی مغربی ممالک نے طالبان کو پیدا کیا تھا۔ اور انہیں اپنے مقصد کے لئے استعمال بھی کیا تھا۔

طالبان کو جب اپنے استحصال کا احساس پیدا ہوا تو وہ مغربی ممالک سے متنفر ہوگئے اور اپنے مذہب کی طرف شدت سے راغب ہوئے لیکن دین کے نام پر انہوں نے وہ راستہ اختیار کیا جو دینِ اسلام تو کیا کسی بھی مذہب کا نہیں ہو سکتا۔ اِسی سبب نے لوگوں کی سوچ کو دو دھاروں میں تقسیم کر دیا ہے۔

ایک طبقہ وہ ہے جو مذہب کے نام پر ہونے والے ظلم اور شدت پسندی کے باعث مذہب اور قومیت کو فراموش کر کے اقتصادی، تجارتی اور معاشی استحکام کی خاطر سرحدوں کے راستے ایک دوسرے پر کھول دیئے ہیں جو انسانیت کے جذبے کو سب سے اہم تصور کرتے ہیں اور تیسری دنیا کے ممالک کو اپنی آئیڈیالوجی کی طرف راغب کرنے پر مجبور کر رہے ہیں۔

اور دوسرا طبقہ وہ ہے جو اب بھی طالبانی ذہنیت رکھتا ہے۔ اُن کی نظروں سے یہ بات بھی پوشیدہ نہیں ہے کہ انسانیت کا ڈھنڈورہ پیٹنے والے یہ مغربی ممالک اپنی معاشی اقتصادی بہتری کے لئے مشرقِ وسطیٰ کے لاکھوں انسانیوں کی زندگیوں سے کھیل رہے ہیں۔ وہ یہ جانتے ہیں کہ خود اُن ہی کے ممالک کے امن پسند شہری اُن کے اس عمل پر شدید احتجاج کر رہے ہیں۔

پروفیسر واحدی جو اِس ناول کا ایک اہم کردار ہے وہ مغربی مفکرین کی کتابیں پڑھ پڑھ کر بہت ساری باتیں مذہب اور قومیت سے متعلق کہتا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شاید بے دین، دہریہ ہوگیا ہے۔ آخر وہ ایسی باتیں کیوں کرتا تھا؟ تو اِس کا جواب ملتا ہے کہ جس لڑکی سے وہ محبت کرتا تھا اِس کے بھائی مسعود نے جو طالبان کے ایک ونگ کا کمانڈر بھی تھا اپنی بہن صوفیہ اور واحدی کے ماں باپ کو محض مسلکی فرق کی وجہ سے قتل کر دیا تھا۔ اِسلام میں پیدا ہونے والے یہ مسلکی فرقے عموماً ایک دوسرے سے سخت نفرت کرتے ہیں۔

پھر طالبان کا لڑکیوں کو تعلیم سے بے دخل کرنے کا فرمان، فنونِ لطیفہ سے نفرت، مذہب کی آڑ میں معاشرتی و سماجی زندگی پر غیر ضروری رسی کسنا اُسے فون پر ڈرانا دھمکانا اُسے ملک کا غدار سمجھنا وغیرہ اِن ساری باتوں نے تعلیم یافتہ پروفیسر واحدی کے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالا تھا اور اُس کی سوچ کے دھارے بدل گئے تھے۔

اسی ناول میں دلیپ اور ثانیہ کی ایک رومانوی جوڑی بھی ہے۔ ثانیہ کے والدین پاکستانی ہیں جو کہ ایک طویل عرصے سے کینیڈا میں مقیم ہیں۔ ثانیہ کینیڈا ہی میں پیدا ہوئی ہے۔ اور یہیں کی فضاؤں میں پلی بڑھی ہے۔ یہ خاندان احمدی فرقے

سے تعلق رکھتا ہے اور اِس کے ساتھ دلیپ سنگھ کا تعلق ہندوستان کے ریاست پنجاب سے جو کینیڈا میں میڈیسن کا طالب علم ہے۔ یہ رومانوی جوڑی اپنے اپنے خاندانوں کے مذاہب اور کلچر سے بے نیاز محبت کی پینگیں بڑھاتی ہے۔ والدین تک یہ اطلاع پہنچتی ہے اور وہی ہوتا ہے جو ہندوستانی اور پاکستانی ماں باپ کا ردعمل ہوتا ہے۔ لیکن محبت کرنے والے بڑی مشکل ہی سے ہار مانتے ہیں۔ کلائمکس پر وہ دونوں اپنے اپنے مذاہب سے بے نیاز ہو کر ایک ہو جاتے ہیں۔

بلند اقبال نے ناول کے آغاز میں جس تشدد کو ادریس کے ہاتھوں انجام پاتے دکھایا تھا اُس کی دہشت اُس کے بچے پر اِس طرح حاوی ہو جاتی ہے کہ چورنگی کی ایک ٹوٹی دیوار کے پیچھے چھپ جاتا ہے اور خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ یہ خوف پھر کبھی اس کی آنکھوں سے دور نہیں ہوتا وہ ہر دم ڈرا سہما اور بیمار سا ہی رہنے لگتا ہے ناول کے اختتام پر بھی پھر ایسا ہی ایک منظر سامنے آتا ہے۔ جہاں ایک قادیانی جوتا فروش اور اُس کے بیٹے کو ادریس اور اس کے ساتھی اُسی مذہبی نفرت کے سبب سے مارتے ہیں اِس کا بچہ عثمان پھر ایک بار اِس واقعے سے خوف زدہ ہو کر اِس ٹوٹی ہوئی دیوار کی آڑ میں چھپ جاتا ہے۔

ناول یہاں ختم ہو جاتا ہے لیکن غور و فکر کے لئے ایک بہت بڑا سوال اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے کہ اگر ہم نے مذہبی بنیادوں پر یا مسلکی فرق سے پیدا ہونے والی نفرتوں اور خون خرابے سے چھٹکارہ نہیں پایا تو آنے والی ہماری نسل وہی ہوگی جو ادریس اور اُس جیسے انسانوں کے بچوں کی ہو سکتی ہے۔

کھوئے ہوئے صفحات کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر بلند اقبال جو ادیب بھی ہیں ، طبیب بھی ہیں اور بہت سوں کے حبیب بھی ہیں اُردو ادب میں اپنا دوسرا کامیاب ناول لکھنے میں کامیاب ہوئے۔ جس کا نام **''کھوئے ہوئے صفحات''** ہے۔ کھوئے ہوئے صفحات بلند اقبال کی تازہ ترین تخلیق ہے جو ۲۰۲۲ء میں عرشیہ پبلی کیشن دہلی انڈیا اور سانجھ پبلی کیشن لاہور پاکستان سے شائع ہوئی۔

ڈاکٹر بلند اقبال ایک کثیر الجہت صلاحیتوں کے مالک ہیں ۔ چیزوں کو دیکھنے اور سمجھنے کا ایک منفرد انداز رکھتے ہیں ان کا یہی منفرد پن اُن کی تحریروں اور باتوں میں بھی نظر آتا ہے ۔ پیشے کے اعتبار سے ایک کامیاب ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ ادب میں لکھنا اور سوچنا اُن کا اوڑھنا بچھونا بن گیا۔

کیونکہ آپ ہندوستان اور پاکستان کے نامی گرامی شاعر اور ادیب حمایت علی شاعر کے بیٹے ہیں جیسے انگریزی میں کہا جاتا ہے کہ '' A tree is fruitknown by its'' آپ کی شخصیت اور فکر میں حمایت علی شاعر کی واضح تشبیہ ملتی ہے۔ ڈاکٹر بلند اقبال کے اِس ناول کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ کرنے سے پہلے ہم اس ناول کا مختلف سطحوں پر تجزیہ کرتے ہیں۔

''کھوئے ہوئے صفحات'' کا مطالعہ ہم سے کئی سطحوں پر تجزیہ طلب کرتا ہے۔ یہ ناول نہ صرف فرد اور معاشرے کے نفسیاتی ، سیاسی ، سماجی اور اخلاقی مسائل پر بھی گفتگو کرتا ہوا ملتا ہے بلکہ تاریخی و جغرافیائی اعتبار سے ہمیں انسانی معاشرے کی تعمیر کے ارتقائی سفر پر کئی گھمبیر سوالات کرتے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔

بلند اقبال نے ناول آغاز جس انتساب سے کیا ہے وہ انسانی تہذیب کی تاریخ میں اس کی سب سے بڑی کمزوری کی نمائندگی کرتا ہے اور مشرق و مغرب دونوں اطراف کے تمدن کے لئے ایک بد نما داغ کی صورت میں نظر آتا ہے۔ شاید اِسی لئے اِس ناول کی تخلیق کے پس منظر میں بلند اقبال کا سوال المیہ بن کر انتساب سے اختتام تک کسی دعا اور تجزیہ کی مشکل میں جا بجا ملتا ہے۔ وہ اپنے انتساب میں لکھتے ہیں۔

''رنگ، نسل، مذہب اور قومیت سے بالاتر ہو کر انسانوں سے پیار کرنے والوں کے نام''

بلند اقبال کی یہ لاشعوری خواہش اُن کے اس شعور کا غماز ہے کہ باوجود اپنے تمام تر دعوؤں کے مشرقی و مغربی دنیا میں انسانوں کی ایک بہت مختصر سی تعداد ہے جو رنگ، نسل، مذہب اور قومیت کی مریضانہ فکر سے آزاد ہے۔ شاید اِس لئے انہوں نے تمام مختصر تعداد کے لوگوں کو انسانیت کی چھتری میں سمیٹ کر ناول کے انتساب کے سپرد کر دیا ہے۔

اور پھر ناول کے اگلے صفحے پر محترم حمایت علی شاعر کے اِس شعر سے فیض اُٹھایا ہے

؎ بجا کہ اپنی دسترس میں لوح بھی قلم بھی ہے
مگر جو کھل کے دل کی بات کہہ سکے، وہ دم بھی ہے؟

یعنی بلند اقبال اپنے تخلیقی تجزیے کو ایک جرأت مندانہ قوت اظہار دینے کی خاطر اور اپنے قاری کو اُن کے تمام تر نظریاتی اختلافات کے باوجود اِس علمی تجربے سے ہمکنار کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ملتے ہیں اور

''خضر باشد موسیٰ ادراک را''

کی مطابقت سے اپنی لاشعوری خواہش کو وہ طاقت پرواز دینا چاہتے ہیں جو لوح و قلم کی دسترس کے ساتھ ساتھ عقل و شعور کی راہنمائی کا سبب بھی بن سکے اور پھر ناول کے اگلے صفحے پر اِس جرأت کے ملتے ہی بلند اقبال اپنے خیالات کو اِن لفظوں سے سجاتے ہیں کہ یوں گماں ہوتا ہے جیسا کہ انہیں ایک قوتِ گویائی نصیب ہوئی ہے۔ وہ جملہ انگریزی میں کچھ یوں ہے:-

"The day we are able to free ourself from the ghettos of colour, race, nationalism and religion. We will deserve to be called HUMAN BEINGS".

گویا اُن کے لئے انسان یا انسانی معاشرے کی بنیادی ضرورت کو پورا ہونے کے لئے یہ شرط لازم و ملزوم ہے کہ وہ ہر صورت میں رنگ، نسل مذہب اور قومیت کے تعصبات اور تقسیم سے سراسر آزاد ہو اور انسانی بھائی چارے دوستی اور محبت و یگانیت جیسے ہنر سے جینے کا علم سیکھ لے یا دوسرے الفاظ میں اگر وہ انسان اِس ہنر سے مبراء ہے تو اِسے خود کو انسان کہنے یا اِس قسم کے گھیوٹز کو انسانی معاشرہ کہنے کا قطعی طور پر حق نہیں ہے۔

بلند اقبال کے ناول ''**کھوئے ہوے صفحات**'' کی کہانی انسانی تاریخ کے اُن قیمتی صفحات کا اعادہ کرتی ہے جو بیسویں صدی میں انسانی تہذیب کے متعدد سانحوں کو سمیٹتے ہوئے کہیں درمیان سے کھو گئے ہیں۔ اور اِن کی جگہ جو صفحات تہذیب کی

کتاب سے دستیاب ہوئے ہیں اُن صفحات نے ایک ایسے معاشرے کو پیدا کر لیا ہے جو رنگ ، نسل ، مذہب اور قومیت کے فرق یا تقسیم کی بنیادوں پر ایک غیر انسانی یا حیوانی معاشرے کے بننے کا سبب بنا ہے۔ یہ تاریخ کی بدنصیبی ہے کہ آج ہم ایک ایسے ہی انسانی معاشرے کے شہری ہیں۔

''**کھوئے ہوئے صفحات**'' مشرق و مغرب دونوں اطراف کے معاشرے کی تاریخی بنت پر ایک چُبھتا ہوا سوال ہے جس کا جواب دینے کی غرض سے بلند اقبال یورپ سے ایشیاء تک کا سفر کرتے ہیں اور پچھلی پوری صدی کے عرصے پر محیط بدترین سماجی ، نسلی اور مذہبی بربریت کے واقعات کا تجزیہ ایک بھرپور کہانی کی شکل میں کرتے ہیں۔ جغرافیائی اعتبار سے اس ناول کا سفر یورپ کے اُن حصوں سے شروع ہوتا ہے جہاں دوسری جنگِ عظیم کے المناک واقعات کے نتیجے میں لاکھوں بے گناہ لوگوں کی اموات ہوئی تھیں اور اختتام کشمیر اور پاکستان کے اُن علاقوں پر ملتا ہے جہاں اِس موجودہ لمحے میں بھی دن رات ظلم و زیادتیاں اور ہلاکتیں ہو رہی ہیں۔

یہاں ایک بات قابلِ غور ہے کہ تاریخ کے ان واقعات میں چاہے وہ مغرب میں ہوئے ہو یا مشرق میں قدرت کی فطری تقسیم کے نتیجے میں مختلف عنوانات سے پیدا ہونے والے بے گناہ انسان جن کا کسی مخصوص علاقائی سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا جو قطعی طور پر معصوم تھی اور جو کسی قوم ، کسی مذہب ، رنگ یا نسل کے خلاف کسی بھی منفی خیال یا جذبے سے معمور نہیں تھے۔

ایسے سادے اور معصوم لاکھوں مرد عورت اور بچوں کو یا تو یورپ کی کئی ایک بستیوں میں زندہ انسانی ڈھانچوں کی شکل میں گیس چیمبروں میں پھینک دیا گیا

اور کچرے کے ڈھیر کی طرح مشترکہ قبروں میں زندہ دفن کر دیا گیا یا غارت گری کا نتیجہ بنا دیا گیا یا پھر جموں کشمیر کے گلی کوچوں اور مشرقی پاکستان کی مختلف بستیوں میں زنا بالجبر اور غارت گری کا نشانہ بنایا گیا۔

اِن تمام واقعات میں ایک ہی قدر مشترکہ تھی کہ بیسویں صدی کے مختلف عہد اور دنیا کے مختلف علاقوں میں وہ تمام مظلوم اور بے گناہ انسان اپنے اپنے ادوار کے بورژوا طبقے کے سیاسی و سماجی انجن کو چلانے کے خاطر ایندھن بنے ۔ اِس ایندھن کی گیلی لکڑیاں گیس اور کوئلہ کا مقدر بننا صرف وہ فطری عمل تھا جس پر اِن انسانوں کا کوئی کنٹرول نہیں تھا کیونکہ فطرت نے انہیں ایک مخصوص رنگ، نسل اور مذہب کے ساتھ ان کی خواہش کے بغیر مختلف قومیتوں میں پیدا کر دیا تھا۔

تاریخ کے اس المناک ارتقائی سفر میں ہونے والا یہ جبر انسانی معاشرے کی موجودہ بناوٹ پر ایک کڑوا طنز اور ایک دردناک چیخ کے سوا کچھ نہیں۔

بلند اقبال نے ''**کھوئے ہوئے صفحات**'' میں اِسی کڑوے طنز اور دردناک چیخ کو رقم کیا ہے۔ اور اِس زخم کو کسی ماہر سرجن کی طرح نہ صرف چیرے لگا کر اپنے پڑھنے والے کو اِس زخم کی گہرائی اور پھیلاؤ سے آگاہ کیا ہے بلکہ اِس کی شدت کا اندازہ کرتے ہوئے رابندر ناتھ ٹیگور، فیض احمد فیض اور پروین شاکر کی خوبصورت نظموں سے سجا کر اِن دلوں کو اس زخم کو برداشت کرنے کا حوصلہ بھی دیا ہے یا مرہم لگانے کی کوشش کی ہے بلکہ یوں کہا جا سکتا ہے کہ ان کے آنسو پوچھنے کی بھی کوشش کی ہے۔

''**کھوئے ہوئے صفحات**'' بیک وقت دو انسانی جنریشنز کا تجزیہ ہے اور محض اتفاق نہیں کہ اِن دونوں جنریشنز کی نمائندگی دو عورتوں ''**ذوسیہ کا سونوا** اور

فاطمہ'' نے کی ہے۔ کیونکہ انسانی تاریخ کے المیوں میں ظلم ہمیشہ کمزور پر ہی ہوتا دکھائی دیتا ہے یہ قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ عورتیں مظالم کا شکار ہونے کے بعد بھی جبراً زندہ بھی رکھی جاتی ہیں یا خوش قسمتی سے بچ جاتی ہیں اور پھر خوش قسمتی سے یہی کربناک زندگیاں تاریخ کی اُن گمنام زیادتیوں پر سے پردہ بھی اٹھاتی ہیں مگر اِس لحاظ سے عورتیں بیک وقت دونوں طرح کے کرب سے گزرتیں ہیں کہ اسے بدترین شکل میں نہ صرف زندہ رہنا پڑتا ہے یعنی انہیں اپنی زندگی میں کئی بار مرنا پڑتا ہے۔

یہی مسلسل مرنے کا کرب اور تکلیف ہمیں ذوسیہ کا سونوا کے کردار میں نظر آتی ہے جو ستر پچھتر سال کی ایک بوڑھی پولش عورت ہے اور کراچی کے ایک علاقے میں تنہا زندگی گزار رہی ہے۔ یہ عورت اپنے ساتھ اپنی گزری ہوئی زندگی کے تجربات ایک ڈائری کی شکل میں اپنے ساتھ سنبھال کر رکھتی ہے جس میں لکھے ہوئے صفحات نہ صرف اُس کی اپنی زندگی کی کہانی سمیٹتے ہوئے نہیں بلکہ انسانی تاریخ کے المناک واقعات سے بھی سیاہ ہو چکے ہیں۔

اِن صفحات میں کہیں وہ آٹھ نو برس کی ایک چھوٹی سی معصوم سی بچی کی شکل میں اپنے خاندان کے ساتھ پولینڈ کے شہر وارسا کی ایک یہودی بستی میں خوش و خرم زندگی گزار رہی ہوتی ہے مگر پھر دوسری عالمگیر جنگ کے بادل اِس خوش و خرم خاندان کو خون آلود بارش سے نہلا دیتے ہیں اور کسی آندھی اور طوفان کی طرح اپنے ساتھ بہا کر لے جاتے ہیں۔

یوں یہ معصوم سی بچی کسی صحرا کی ریت بن کر انسانوں کی ایک حیوانی دنیا کے سپرد ہو جاتی ہے اور ایک کربناک سناٹے کا شکار ہو جاتی ہے۔ جو تنہائی اور ویرانہ بن کر اِس کی روح اور بدن کے تمام خلیات کا حصہ بن جاتا ہے۔

ناول میں ذوسیہ کا سونوا کی زندگی نازی جرمن کے ہاتھوں اس کے خاندان کی ہلاکت، ذوسیہ کی ماں کی جنسی زیادتی اور پھر گمشدگی اور بالآخر خود اِس کی زبردستی عصمت دری اور ''جرمینائزیشن'' جیسے واقعات سے معمور ہے ان واقعات کے پس منظر میں ایڈولف ہٹلر کی یہودی نسل کے خاتمے کے خاطر لاکھوں لوگوں پر ظلم و جبر شامل ہے جن میں خصوصاً عورتیں اور بچے شکار ہوئے تھے۔ اس دوران نازیوں نے جنگ کے دوران قابض یورپ کے مختلف علاقوں میں بنائے گئے حراستی کیمپوں اور جیلوں میں لاکھوں لوگوں کو قید کر کے نہ صرف اُن کا قتلِ عام کیا تھا بلکہ اُن یہودی آبادیوں کو نئی انسانی سوسائٹی میں منتقل کر کے وہاں کے کم ترین کام کروا کر اِس نسل کو مکمل ختم کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔

ناول پر ایک مقام پر ذوسیہ کا سونوا اپنے ساتھ ہونے والے ہولناک واقعات کا ذکر کرتے ہوئے ایک لفظ ''**اونٹہ نیچ**'' کا ذکر کرتی ہے۔ یہ لفظ ناول میں ذوسیہ کا سونوا سے فاطمہ تک اور انسانی معاشرے میں پہلے انسان آدم سے نئی دنیا کے آخری پیدا ہونے والے انسان کی ترجمانی کرتے ہوئے ملتا ہے کہ پوری انسانی نسل اِس لفظ میں سمٹ کر ''**اِنسان یا انسانیت**'' کے بجائے محض ''**اونٹہ نیچ**'' کہلائے جانے کی شکل میں دکھائی دیتی ہے۔ یہی وجہ کہ جب فاطمہ ذوسیہ کا سونوا سے اونٹہ نیچ کے معنی دریافت کرتی ہے تو وہ چند سطروں میں ہی تمام تر انسانی غرور اور اس

کی تعریف کو ننگ و شرمندگی سے تعبیر کر کے ایک گہری سانس لے کر چپ ہو جاتی ہے۔ وہ کہتی ہے:-

''اونٹہ تیج، جرمن زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی شائد خدا کے شعور میں بھی نہیں ہیں''

بلند اقبال یہی کہنا چاہتے ہیں کہ خود خداوند بھی اپنے تخلیق شدہ انسان سے اِس کم ظرفی اور گراوٹ کی توقع نہیں رکھتے ہونگے اور یوں وہ خداوند کے شعور کو رنگ نسل قومیت اور مذہب کی تفریق کا ذمہ دار ٹھہرانے کے بجائے ایک گنجائش پیدا کرتے ہیں کہ انسانی تخلیق میں اس قسم کی تقسیم ایک عین فطری مظہر تھا۔

مگر انسانوں نے اپنے سیاسی و سماجی فوائد کے لئے اس بے رحمانہ طور پر استعمال کیا اور غیر انسانی رویوں پر مبنی سوسائٹی بنائی وہ کہتی ہے:-

''فاطمہ کچھ لفظ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے وجود میں چھپی ہوئی دھکتی ہوئی آگ سے انسانیت کو بار بار جلا کر راکھ کرتے ہیں ایک ایسا ہی لفظ اونٹہ تیج بھی جو تمھیں اپنی زندگی میں اکثر بد نمائی کے ساتھ بے شرمی سے ناچتا ہوا ہر طرف دکھائی دے گا مگر سنو بیٹی! اگر تمھیں کبھی وہ دکھائی دے تو اپنی آنکھیں زور سے بند کر لینا۔ اُسے خود میں کبھی بھی داخل نہ ہونے دینا ورنہ وہ تمھیں مار کر انسان سے ایک حیوان بنا دے گا''

ذوسیہ کا سونوا جوں جوں اپنی گزری ہوئی زندگی کے صفحات پلٹتی ہے اور اپنے ساتھ ہونے والے واقعات اس کے ساتھ مختلف خاندانوں کے ساتھ ہونے والے حادثات اور نازی فوجیوں کے ظلم و ستم کے حالات بیان کرتی جاتی ہے۔ وہ مناظر اور اشکال ماضی کے جھروکوں سے نکل کر فاطمہ کی روح کو گھائل کرتے ہیں اور خود اس کی اپنی زندگی کے کھوئے ہوئے صفحات کو ڈھونڈنے کے لئے ایک مسلسل تجسس اور بے چینی کا سبب بنتے ہیں۔ یہ تجسس اور بے چینی کبھی کبھار اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ فاطمہ کتنی بار ٹوٹتی اور بکھرتی ہے۔

یہاں بلند اقبال فاطمہ کے زخم خوردہ احساسات اور جذبات کو رابندر ناتھ ٹیگور کی خوبصورت نظموں سے مرہم لگاتے ہوئے ملتے ہیں۔ جو بیک وقت اُن کے قاری کے لئے بھی دادرسی کا سبب بنتے ہیں۔ اس دوران ذوسیہ کے بچپن نوجوانی اور اِس کے بعد کا دور کے واقعات ایک مظلوم اور بے سہارہ عورت کا انسانی سوسائٹی میں درجے کا تعین کرتے ہیں۔ اور بارہا ذوسیہ کا خاموش احتجاج ننگ انسانیت کا اظہار بنتا ہے اور ایک قاری کے لئے مسلسل احساسِ شرمندگی کا سبب بنتا ہے۔

ناول میں ایک مقام پر ذوسیہ کا سونوا کا فاطمہ سے یہ کہا ہوا جملہ بھی خاصا قابلِ غور بنتا ہے جب وہ اپنے خاندان کی قتل و غارت گری اور ماں کی بے عزتی کا سبب حملہ کرنے والے اُن جرمن نازیوں کو بناتی ہے جو نسلی و مذہبی بیمار فکر سے آلودہ تھے مگر پھر بھی اپنی تباہی و بربادی اور بے عزتی کا مجرم اُن روسی فوجیوں کو بتاتی ہے جو نسلی و مذہبی تقسیم کی بنیاد پر ہونے والی جنگ کے خلاف اُس کی زندگی اور عزت بچانے آئے تھے۔ یہاں ذوسیہ کا سونوا جتنی بنیادوں پر قائم شدہ مرد اور عورت

کے تقسیم شدہ معاشرے میں عورت کے مقام کا کڑوے اور کسیلے انداز میں تذکرہ کرتی ہے کہ عورت محض ایک ہی قسم کے طور پر سمجھی دیکھی اور برتی جاتی ہے اور ظلم کرنے دیکھنے اور برتنے والا ہر حالت میں ایک مرد ہی ہوتا ہے۔

یہاں جنس کا فرق دراصل رنگ، نسل، مذہب اور قومیت سے اگلے یا اِس سے بھی زیادہ گرے ہوئے مقام پر ملتا ہے کہ اگر یہ مخصوص عناصر سیاسی و سماجی ظلم و زیادتی کا سبب بنتے ہیں تو دوسری طرف جنسی حیوانی جبلت بھی جوں ہی سازگار ماحول دیکھتی ہے طاقتور جنس کمزور جنس کا شکار کر لیتی ہے ایسے حالات میں اخلاقیات اور انسانیت وغیرہ محض بے معنی لفظوں کے انبار کے سوا کچھ معنی نہیں رکھتے ہیں۔

ایسے مواقع پر جہاں ایک جانب ذوسیہ کی زندگی کے المناک واقعات فاطمہ کے انسانیت پر اعتبار و اعتماد کے ٹوٹنے کا سبب بنتے ہیں تو دوسری طرف ٹیگور، فیض احمد فیض اور پروین شاکر کی نظمیں فاطمہ کے ڈوبتے ہوئے دل کا سہارہ بنتے ہیں بلکہ حوصلہ بھی دیتے ہیں کہ وہ تاریخ کے اُن گزرے ہوئے کربناک واقعات سے اپنی کھوئی ہوئی زندگی کی کڑیوں کو جوڑنے کی کوشش کر سکے اور اپنی شناخت کے سفر کو جاری رکھ سکے۔

کھوئے ہوے صفحات میں فاطمہ اور ذوسیہ کا سونوا کے صفحات کا ملاپ دراصل مغرب اور مشرق کا ایک شرمناک ملاپ بھی ہے جس کی بنیادوں میں رنگ، نسل اور مذہب کا فرق بے ہنگم انداز میں یکساں ہے۔ ذوسیہ کا سفر پولینڈ کے شہر ''وارسا'' سے شروع ہوا اور جرمنی اور یورپ کے قبہ خانوں سے ہوتا ہوا تقسیم

سے قبل کے ہندوستان اور پھر پاکستان کے شہر کراچی سے ہوتے ہوئے ڈیفنس سوسائٹی تک نظر آتا ہے۔

مگر یہ سفر محض ذوسیہ کا سونوا کا نہیں بلکہ اُن خون آلودہ صفحات کا بھی ہے جو تاریخ کی کتاب سے اڑ کر مغرب سے مشرق میں پہنچ کر اپنی معنویت کا تعین فاطمہ کی شناخت کی شکل میں کرتے ہیں۔ یہ سفر ذوسیہ کا سونوا کے سفر سے کچھ مختلف ہو کر بھی بہت مماثلت رکھتا ہے کہ فاطمہ کا پس منظر اور ذوسیہ کا پیش منظر مل کر تاریخ کی اِس بکھری ہوئی کتاب کو مکمل کر دیتے ہیں۔

فاطمہ **''کھوئے ہوے صفحات''** کی پروٹو گونسٹ اور نمائندہ یا مرکزی کردار سے یہ ناول کہنے کو فاطمہ کی زندگی کا ذکر ہے مگر یہ ذکر ذوسیہ کا سونوا کی موجودگی کے بغیر ادھورا ہے۔ یہ ذکر اُس کے محبوب اسد کے ساتھ کے بِنا تنہا ہے اور یہ ذکر بنگلہ دیش میں اُس کی مددگار **''کلپنا''**، اُس کے باپ **''فنان''** اور اُس کے آفس کے اسٹاف اور ذوسیہ کے پڑوسی تحسین جعفری کے بغیر بھی نامکمل ہے۔ فاطمہ جو بچپن میں اپنی ماں کی طلاق کے بعد بنگلہ دیش سے پاکستان آجاتی ہے اور اِس بات سے بے خبر رہتی ہے کہ اُس کی ماں کی یہ ہجرت صرف معاشی ضرورت کے سبب سے نہیں بلکہ اپنی شناخت کے المیے کی وجہ سے بھی تھی۔ اِس ہجرت کے پیچھے ایک غصہ، ایک نفرت اور ایک فرسٹیشن بھی تھی۔

ایک ایسی غریب عورت کی فرسٹیشن جو اُس شخص کو ڈھونڈ کر اپنے ہونے کا سبب جاننا چاہ رہی تھی جس کی جنسی زیادتی کی وجہ سے وہ اپنے معاشرے (بنگلہ دیش) میں ایک گالی کی شکل میں پیدا ہوئی تھی اور جس شناخت کے ''نا'' ہونے کی وجہ سے اُسے طلاق ہوئی تھی اور اپنے معاشرے سے اُسے دھتکار دیا گیا تھا۔ فاطمہ

ایک ٹوٹے پھوٹے ہوئے خاندان سے ضرور تھی مگر اپنی غریب ماں کی جد وجہد کے بدلے میں اپنی زندگی کو ایک بہتر سوشل شکل میں لانے کے لائق ہو چکی تھی۔

ناول میں فاطمہ کی زندگی میں بھونچال کا سبب اُس کی ماں کے مرنے کے بعد اُسے ملنے والے چند ڈائری کے صفحات اور تصاویر تھی جنہوں نے اُسے اُن کی اصل کتاب یا تصاویر کے کرداروں کو ڈھونڈنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ اُس کی ماں کے پاس سے ملے ہوئے یہ صفحات کس کتاب یا ڈائری سے منسوب ہیں؟

کیونکہ یہی واحد راستہ تھا جو اسے اپنی ماں یا خود اپنی شناخت کی طرف بھی لے جا رہا تھا۔ فاطمہ کی زندگی کیا یہ سفر اگر ایک طرف اُس کے جنون اور جستجو کا شکار تھا تو دوسری طرف اُس کے محبوب اسد کی طرف سے بھی بے چینی اور گھبراہٹ کا بھی سبب تھا کیونکہ اسد کا تعلق بھی اتفاق سے فوج سے تھا اور وہ اپنی نوکری کے سلسلے میں جموں کشمیر کے آس پاس تعینات تھا۔

جموں کشمیر اور مشرقی پاکستان کے واقعات گو کہ دو مختلف طرز کے سیاسی مسائل تھے مگر دونوں کی بنیادوں میں زبان، قومیت اور مذاہب کے فرق اپنے اپنے لحاظ سے انسانی ہلاکتوں اور قتل و غارت گری کے لئے پیش خیمہ تھے اور اس کے اثرات براہِ راست فاطمہ کی زندگی پر نظر آرہے تھے۔ فاطمہ کی ماں کی شناخت کا سفر تو اس کی زندگی میں ادھورا ہی رہتا ہے مگر فاطمہ ذوسیہ کو ڈھونڈ کر نکالتی ہے اور اس سے ملاقات کرتی ہے اور یوں تاریخ کے اُن المناک واقعات سے آگہی کی وجہ اس کی تعمیر و تکمیل کا دور شروع ہوتا ہے۔

ناول کے ایک مقام پر فاطمہ کراچی میں ذوسیہ کا سونوا سے ملنے کے بعد اپنی ماں کے وطن بنگلہ دیش کے شہر ڈھاکہ جاتی ہے اور پھر اتفاق سے اپنے باپ منان سے اُس کا سامنا ہو جاتا ہے جو اُس کی ماں کے والد کا پتہ نہ ہونے کی وجہ سے فاطمہ کی پیدائش کے فوراً بعد طلاق دے دیتا ہے۔ یہاں فاطمہ ایک پدارنہ معاشرے میں عورت کی سماجی حیثیت سے واقف ہوتی ہے۔ اِس دوران وہ اپنی ایک مددگار دوست کلپنا کی مدد سے ۱۹۷۱ء میں بنگلہ دیش کی تشکیل کے دوران عام بنگالی مردوں اور عورتوں پر ہونے والے ظلم و بربریت سے واقف ہوتی ہے اور یوں ایک بار پھر رنگ، نسل، مذہب اور زبان کی تقسیم کو مشرقی دنیا میں خون خرابے کا سبب دیکھتی ہے۔

ناول کا دوسرا حصہ قاری کو ذوسیہ کا سونوا کے ماضی سے فاطمہ کے ماضی میں تو ضرور منتقل کرتا ہے مگر تاریخ کے واقعات کو دوسری عالمگیر جنگ کے ۱۹۴۰ء کے واقعات سے ۱۹۷۱ء میں پہنچا کر دوسری جنریشن کو اُن ہی واقعات سے دوچار کرتا ہے گو کہ اِس درمیان تین دہائیاں اور مغرب اور مشرق کا فرق مگر انسانی فکری پسماندگی کے مریضانہ سفر میں کوئی مثبت تبدیلی نظر نہیں آتی ہے۔ فاطمہ بنگلہ دیش میں جس نفسیاتی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتی ہے وہ سیاسی و سماجی بے انصافیوں کے علاوہ پدرانہ فکری رویوں کی بنیادوں پر نشوونما پانے والے انسانی معاشروں میں شکار ہونے والی عورتوں کے درد سے آگاہی کی وجہ بھی ہوتی ہے۔

فاطمہ کا اعتبار جو ذوسیہ کا سونوا کی زندگی کے واقعات سن کر مغربی تہذیب پر سے اٹھ گیا تھا۔ اِس بار خود اپنی ماں کی زندگی کے واقعات جان کر پوری انسانیت پر سے اعتبار اٹھ جاتا ہے۔ اور وہ مکمل طور پر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ بنگلہ

دیش کے سفر کے دوران اُسے ۱۹۷۱ء کی جنگ کے دوران ہونے والے واقعات کی گواہی لبریشن میوزیم ڈھاکہ میں دکھائی دیتے ہیں۔ وہاں موجود تصاویر ، انسانی ڈھانچوں اور عورتوں اور بچوں کے ساتھ جانے والے دانشوروں پروفیسرز، ڈاکٹرز، رکشے والوں، مزدوروں اور معصوم راہگیروں وغیرہ کے خون سے رنگے ہوئے قصے جان کر اُس کا سر انسان ہونے کے ناطے شرم سے جھک جاتا ہے۔ اس ایک لمحے میں وہ قومیت زبان، مذہب ، نسل اور رنگ سے قطع نظر صرف انسان رہ کر بھی ان واقعات کا ذمہ دار سمجھ کر ایک سخت ترین احساس شرمندگی کا شکار ہوتی ہے۔

''**کھوئے ہوئے صفحات**'' میں فاطمہ کی زندگی کا دوسرا پہلو جموں کشمیر میں ہونے والی ظلم و ستم اور زیادتیوں کی طرف بھی ملتا ہے جہاں خود اس کا محبوب اسد ایک پاکستانی فوجی کی شکل میں ہندوستان کے فوجیوں کے ساتھ محاذ آرائیاں کرنے میں مصروف ہوتا ہے۔ کشمیر میں ہندوستانی فوجیوں کے ہاتھوں ہونے والی تباہی و بربادی فاطمہ کے لئے ایک فکری سوال اور نفسیاتی الجھن بن جاتا ہے کیونکہ مغرب اور مشرق کی جنگوں میں دونوں اقدار اُسے مشترک دکھائی دیتی ہیں۔ ایک جانب اُسے رنگ ، نسل ، مذہب اور قومیت کے تضادات نظر آتے ہیں دوسری جانب اُسے اُن معصوم انسانوں کی بربادی دکھائی دیتی ہے جن کا کسی قسم کی ملی یا مذہبی آئیڈیالوجی اور لسانی یا سیاسی جھگڑے میں کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ وہ تو صرف فطرت کی تقسیم کی وجہ سے سیاسی و سماجی خود غرضیوں کا شکار ہو رہے تھے۔

ناول میں اسد فاطمہ کی پہلی اور آخری محبت تھا وہ اُس کا یونیورسٹی کے زمانے کا دوست تھا وہ ادب کا طالب علم تھا۔ ایک شاعر تھا۔ آرٹسٹ تھا۔ انسانی حقوق کی مساوانہ تقسیم کا طلب گار تھا اور زندگی کے لئے ایک مثبت نقطہ نظر رکھتا

تھا۔ مگر معاشی مسائل کی وجہ سے آئی ایس پی آر کا ملازم ہو کر پاکستان کی فوج میں شامل ہو گیا تھا۔ وہ ایک ایسی ملازمت میں تھا جو اُس کے مزاج اور شخصیت سے قطعی مختلف تھی اس دوران فاطمہ کے لئے اپنے خطوط کے ذریعے نہ صرف کشمیر کی وادیوں میں ہندوستانی فوجیوں کا نہتے کشمیریوں پر ہونے والے ظلم و ستم اور زیادتیوں کی گواہی بنتا ہے۔

بلکہ فاطمہ کے لئے فطری طور پر ایک بے چینی اور تشویش کا سبب بھی بن جاتا ہے کیونکہ فاطمہ کسی طور پر اِس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ اس کے محبوب اسد کا دل ایک خوبصورت شاعر اور سیاسی و سماجی نا انصافیوں کے خلاف فکر مند انسان کی طرح دھڑکنے کے بجائے ایک سخت جان فوجی کے دل سے بدل جائے۔ وہ ایک ایسا انسان بن جائے جو خود غرض سیاسی و قومی پالیسیوں پر فوجی لیڈروں کو سیلوٹ مار کر معصوم انسانوں کی قتل و غارت گری اور ظلم و زیادتیوں کا سبب بن جائے۔ فاطمہ اپنی تمام تر تگ و دو اور شناخت کے عمل سے گزر کر اسد سے اپنی محبت کے بدلے میں ایک انسان ہونے کا حق مانگتی ہے اور یوں یہ ناول اپنی منطقی انجام پر پہنچ جاتا ہے۔

ناول ''**کھوئے ہوئے صفحات**'' ایک ملٹی ڈائمنشنل کہانی ہے جس کے مرکزی کردار ناول کے صفحات پر ناول کی نفسیاتی اور سیاسی توجہات کرتے ہوئے ملتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کرداروں کا تجزیہ درحقیقت ناول کی کہانی کی تقسیم کر دیتا ہے۔

ذوسیہ کا سونوا بیک وقت ایک مظلوم یہودی عورت ہے جس کی ساری زندگی سیاسی و سماجی مظالم کے نتیجے میں ایک المناک کرب کی حالت میں گزرتی ہے۔

ذوسیہ کا سونوا بچپن میں اپنے ماں باپ اور خاندان کے دیگر افراد کو محض یہودی ہونے کی وجہ سے جرمن نازی فوجیوں کے ہاتھوں قتل و غارت گری اور برباد ہونے کا شکار ہوتے ہوئے دیکھتی ہے اِس سارے ظلم کے نتیجے میں اس کا ذہن ڈپریشن کی اگلی منزل یعنی مکمل اے پیتھی کی طرف چلا جاتا ہے یعنی ایک ایسی کیفیت کی طرف جہاں انسان درد اور خوشی سے ماورا ہو جاتا ہے یعنی مکمل طور پر نم ہو جاتا ہے۔

جس کے بعد ذوسیہ کے لئے موت کا خوف اور زندگی کی طلب جیسے معنی ختم ہو جاتے ہیں یہ ایک ایسا مقام ہوتا ہے جہاں انسان صرف ایک مادہ بن کر رہ جاتا ہے جو حس سے عاری ہوتا ہے کیونکہ زندگی کے اطراف ہونے والے واقعات پر سے اُس کا اختیار مکمل طور پر ختم ہو چکا ہوتا ہے۔ اور اُن واقعات کے نتائج سے فرار قطعی ناممکن ہوتا ہے ایسے حالات میں سوسائٹی میں ہونے والے واقعات اور انہیں برتنے والے کردار بھی محض گزرتے ہوئے واقعات بن جاتے ہیں۔ وہ بے انتہا بے حس ہو جاتے ہیں۔ اِن کا کسی بھی طرح کی امید سے ربط ٹوٹ جاتا ہے۔ ذوسیہ کا سونوا کی زندگی کے واقعات نے اُس کو بھی کم و بیش اِسی نفسیاتی مقام پر لا کھڑا کیا تھا۔ جہاں تک پہنچنے والے راستے تاریک ترین اور منزل گمنام تھی۔

یہی وجہ ہے کہ ناول میں ذوسیہ کا سونوا کے مکالمے اُس کے جذبات و احساسات سے سراسر عاری نظر آتے ہیں۔ مگر اندرونِ خانہ اِن کی معنویت تاریخ کی تلخیوں سے بوجھل ہوتے ہیں مگر جونہی ہم اِن لفظوں کو ذوسیہ کا سونوا کی زخمی روح سے ہمکنار کرتے ہیں۔ تو ان جملوں میں ایک درد اور چیخ کی شدت بھی بارہا سنائی دیتی ہے۔

ناول کے ان مقامات پر جہاں ذوسیہ اپنی ڈائری کے صفحے فاطمہ سے شئیر کرتی ہے وہاں ڈاکٹر بلند اقبال تخلیقی چابک دستی سے ذوسیہ کے لفظوں میں سے کچھ اِس طرح احساس کی شدت بھرتے ہیں کہ اُس میں بیک وقت ایک تجربہ کار بوڑھی عورت کا وقار اور زندگی بھر کا کرب بھی موجود ہوتا ہے۔ اور انسانیت سے اٹھی ہوئی ان کی بے اعتباری بھی نمایاں نہیں ہوتی ہے۔ کیونکہ اِس توازن کا حصول ہی ذوسیہ کا سونوا کے کردار کا حسن ہے۔

ذوسیہ کا سونوا کی ماں کی نازی فوجیوں کے ہاتھوں وارسا کی گلیوں میں عصمت دری اور پھر مریضانہ حد تک تعصبانہ نفرت انگیز رویے کی تسکین کی خاطر اُن فوجیوں کا اُس کی آدھ سری ماں کے بدن پر پیشاب کرنے کا واقعہ اور خود اُس کے ساتھ ہونے والی منہ بولے باپ (گارجین) کے ہاتھوں عصمت دری جیسے واقعات کو سننے کے بعد فاطمہ ایک مستقل متلاہٹ کا شکار ہو جاتی ہے۔ یہ متلاہٹ انسانوں بدترین شکل کو پہچان کر لیتی ہے۔

فاطمہ کی یہ متلاہٹ دراصل **''کھوئے ہوے صفحات''** کے ہر ایک قاری پر طاری ہو جانے والی متلی کی کیفیت ہے جس میں رنگ، نسل، مذہب اور قومیت کے فرق کی بنیادوں پر انسانوں کو تقسیم دیکھنے کا جذبہ یا خیال بھی ہے۔ ذوسیہ کا سونوا بہت کم عمری میں ہی انسانوں کی انسانوں پر بربریت کا مطلب سمجھ لیتی ہے۔ گو کہ وہ فاطمہ سے کہتی ہے کہ جن کیمپوں کی دیواروں کے پاس کچھ مرد یا عورتیں جمع ہو کر چیخ و پکار کر کے احتجاج کرتے تھے تو جرمن فوجی اپنی اپنی زبان میں چیختے اور چنگاڑتے تھے اور پھر فوجی بوٹوں یا بندوقوں کے بٹ سے انہیں مارنا شروع کر دیتے تھے بلکہ کبھی کبھار ان احتجاج کرنے والوں کو بے دردی سے گولیاں مار کر ختم کر

دیتے تھے۔ اور پھر ٹرکوں میں ڈال کر پہلے سے بنی ہوئی مشترکہ قبروں میں پھینک کر مٹی ڈال دیا کرتے تھے۔

ذوسیہ کا سونوا کے مکالموں میں ایک دبی دبی چیخ ضرور ہے مگر اس کی اصل مزاحمت ہمیں اِس وقت دکھائی دیتی ہے جب اُس کا اپنا نوجوان بیٹا **''پیٹر کا سونوا''** بڑا ہو کر پاکستانی فوج میں شامل ہو جاتا ہے اور مشرقی پاکستان کی تقسیم کے وقت نہتے بنگالیوں پر وہی ظلم کرتا ہے جو ذوسیہ اور اُس کی ماں کے ساتھ ہوا تھا۔

ناول کے اس مقام پر ذوسیہ بالآخر اپنے اندر جمع شدہ زندگی بھر کی فرسٹیشن اور غصے کو اپنے اکلوتے بیٹے پر نکال دیتی ہے جو اُس کے بڑھاپے کا واحد سہارا ہوتا ہے۔ وہ اُسے اپنی زندگی سے نکال پھینکتی ہے۔ ذوسیہ اس موقع پر پیٹر کو جو چند سطریں لکھتی ہے اُس کی روشنی مین پیٹر اور ذوسیہ کے کرداروں کو مزید تجزیہ ممکن ہو سکتا ہے۔

''پیٹر تم نے جو کچھ بنگلہ دیش میں کیا اُس کے بعد تم میرے بیٹے ہونے کا حق کھو چکے ہو۔ کاش تمھیں اندازہ ہوتا کہ تم نے کیا کر دیا؟

تم نے بنگلہ دیش میں اُن معصوم بنگالی لڑکیوں کے ساتھ زنا نہیں کیا بلکہ تم نے میری ماں اور اپنی ماں کے ساتھ زنا کیا۔ تم نے تاریخ کے اُن ہی صفحات کو دوبارہ لکھ دیا جن کے کھوئے ہوئے صفحات کو میں ڈھونڈنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ تمھارے لئے میرے

دل اور گھر کے دروازے اب ہمیشہ کے لئے بند ہو چکے ہیں''

اس خط کی پہلی دو سطروں کے نتیجے میں پیٹر پر جو اثرات مرتب ہوئے ہیں اور یوں وہ اپنی زندگی میں خود کو ہمیشہ کے لئے قبرستان کے سپرد کر دیتا ہے اور نشے اور ڈرگز کے سہارے باقی زندگی وہی گزار دیتا ہے۔ ذوسیہ کا سونوا ماں ہونے کی فطری محبت سے مجبور ہو کر پیٹر کو سالہا سال تک کھانا پہنچانے قبرستان جاتی ہے۔ مگر اُس کے برے ترین حالات کے باوجود دوبارہ اپنی زندگی میں اُسے آنے کی اجازت نہیں دیتی ہے۔ ذوسیہ کا سونوا کی یہ مستقل کشمکش پہلے اُس کی زندگی مگر بعد میں پیٹر کی موت کی وجہ سے خود اُس کی اپنی بھی موت کا سبب بن جاتی ہے۔

دوسری طرف ذوسیہ کی کہی ہوئی آخری دو سطریں ظاہر کر رہی ہیں کہ وہ امید اور نا امید کی منزلوں سے آگے نکل چکی تھی یہی وجہ تھی کہ تلاش کا سفر اُس میں سے ختم ہو چکا تھا۔

شائد اس لئے بلند اقبال جان بوجھ کر ذوسیہ کا سونوا اور فاطمہ کے درمیان چند سوالات کا ایک مکالمہ ناول کے ابتدائی صفحات میں ہی رکھ دیتے ہیں۔ ذوسیہ فاطمہ سے پوچھتی ہے کہ وہ اُس سے کیوں ملنے آتی ہے تو جواب میں فاطمہ اُس سے چند تصاویر کا مطالبہ کرتی ہے اور کہتی ہے جی مجھے لگتا ہے کہ میں اِن تصویروں کی مدد سے تاریخ کے ٹوٹے ہوئے کچھ سروں کو جوڑ پاؤں گی۔ جس کے جواب میں ذوسیہ کا سونوا اپنے پورے وقار سے اگلا سوال کرتی ہے کہ کیا واقعی اس بات کی ضرورت ہے؟ اور فاطمہ ذوسیہ کے بالغانہ سوال کے جواب میں اپنی کم عمری اور ناتجربہ کاری

کے بدولت بوکھلا جاتی ہے اور پہلے ''**شاید**'' اور پھر یقیناً کہتی ہے۔ ظاہر ہے ذوسیہ کا سونوا اپنی زندگی میں ان دونوں مقامات سے گزر چکی ہوتی ہے۔

اس لیے وہ اگلے سوال کے ذریعے فاطمہ کی ذات میں داخل ہو جاتی ہے مگر اس بار بھی اِس مکالمے میں تجسس، بے چینی، فرسٹیشن اور شکست خوردگی کا عنصر ظاہر کیے بغیر وہ محض ایک سطر میں ہی اپنی پوری زندگی کا تجربہ بیان کرتے ہوئے سوال کرتی ہے مگر یہ بہت ہی پیچیدہ اور طویل سفر ہے ''**کیا تم طے کر پاؤ گی؟**'' اور جب اسے فاطمہ کے لہجے میں اُسے اعتماد نظر آتا ہے تو ہو اپنی چند تصاویر اُس کے حوالے کر دیتی ہے۔

اور یوں ذوسیہ کا سونوا اور فاطمہ کی زندگی کا سفر شروع ہو جاتا ہے مگر یہ سفر فاطمہ کے لیے بیک وقت تجسس اور قدرے حیرانگی کا بھی ثابت ہوتا ہے جس کا اظہار وہ اپنے محبوب اسد کو ایک خط میں لکھ کر کرتی ہے۔ جس دوران وہ اپنی اور ذوسیہ کا سونوا کی ملاقات کا ذکر کرتی ہے اور کہتی ہے کہ آج اُس کی ملاقات ایک ایسی عورت سے ہونے جا رہی ہے جس کا اکلوتا بچہ مر گیا ہے جو تنہا رہتی ہے اور جس کی روح میں ریت ہی ریت بھری ہوئی ہے۔

یہاں بلند اقبال ناول کی کہانی میں تجسس کے عنصر کو برقرار رکھنے کی خاطر پیٹر کی موت کا ذکر کرتے ہیں مگر یہ موت دراصل ذوسیہ کا سونوا کے لئے پیٹر کا سونوا کے بد نما کردار کی وجہ سے ہونے والی اُس میں موجود انسانیت کی موت ہوتی ہے یعنی یہ جسمانی موت کی بجائے ایک استعاری یا معنوی موت ہوتی ہے۔ یہاں ذوسیہ کا سونوا کے لہجے میں اصل میں بلند اقبال یہی پیغام دینا چاہتے ہیں کہ جب کوئی انسان

قومی، مذہبی اور لسانی تعصب کی بنیادوں پر دوسرے انسان کی زندگی یا عزت چھیننے کا سبب بنتا ہے تو وہ زندہ رہنے کے باوجود مردہ ہو چکا ہوتا ہے۔

اس لحاظ سے پیٹر کا سونوا کا زندگی ہی میں قبرستان کے سپرد ہو جانا اور نشے کی حالت میں رہ کر زندگی سے کنارہ کش ہو جانے کا واقعہ ناول میں اپنے معنی متعین کر لیتا ہے۔ جبکہ ناول کی پروٹو گونسٹ فاطمہ کا سفر سراسر شناخت سے وابستہ ہے مگر یہ سفر محض اُس کی اپنی ذات یا خاندان کی شناخت تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ انسانی تاریخ میں ہونے والی سیاسی، سماجی اور معاشی ناہمواروں کو جاننے کا یا اُن کی شناخت کا بھی یہی سفر ہے اس سفر کے دوران فاطمہ کے شعور میں سفاکی سے یہ آتی ہے کہ ہر دور میں اِن ناہمواریوں کی وجہ سے انسانیت ایک آزمائش کے سپرد ہوتی رہتی ہے۔

اور بدقسمتی سے ہر دور میں انسانی معاشروں میں آباد بے بس اور لاچار مظلوموں کی زندگی کے حصے میں تباہی و بربادی ہی نظر آتی ہے جبکہ ظالموں کے لیے حیوانیت کے مقام تک گرنا ہی اُن کا مقدر بن جاتا ہے۔

ظاہر ہے اِس سارے عمل کی آگہی اور شناخت کے سفر میں وہ کئی پژمردگی اور نا امیدی کا شکار ہوتی ہے مگر پھر اِس کی فطری جرأت اور اسد سے محبت ان تمام حالات سے لڑنے کا اُسے حوصلہ دیتی ہے اور وہ ان مشکل مقامات سے گزرتی ہے جس دوران اُسے انسانی تاریخ سے سماجی اور سیاسی آگاہی نصیب ہوتی ہے اور یوں وہ ایک نئی نفسیاتی معنویت سے ہمکنار ہوتی ہے اس تمام تر سفر کے بعد فاطمہ کی زندگی کا راستہ زیادہ کشادہ اور روشن ہوتا چلا جاتا ہے اور وہ انسانی معاشروں کی صحیح تعریف کرنے کے لائق ہو جاتی ہے اور پھر اپنی زندگی میں وہ شعوری فیصلے کرتی ہے جو حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں۔

اِس نقطہ نظر سے اگر ہم دیکھیں تو ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ فاطمہ کا کردار ایک مستقل توازن کی طرف رہنے کی تگ و دو میں مصروف ہے کیونکہ اِس کردرار کے توازن میں ناول کی کہانی اور پلاٹ کا بھی توازن پوشیدہ ہے۔ فاطمہ ایک نوجوان لڑکی ہے یعنی اُس کا تعلق اکیسویں صدی کی ینگ جنریشن سے ہے جو ایک جنرلسٹ (صحافی) ہے۔ یونیورسٹی سے پڑھی ہوئی ایک ذہین و فطین طالبہ ہے اور سوشلی طور پر سوسائٹی کی ایک متحرک ممبر بھی ہے۔ وہ ایک پریکٹیکل لڑکی ہونے کے علاوہ اپنے ارد گرد کی سیاسی و سماجی تبدیلیوں پر بھی ایک تنقیدی اور تجزیاتی نظر بھی رکھتی ہے۔

بلند اقبال نے فاطمہ کے کردار کو اِس رخ کے ساتھ ایک خاص مقصد کے ساتھ تعمیر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُسے ایک صحافتی ادارے سے وابستہ دکھایا گیا ہے جہاں وہ مسلسل نیوز اور آرٹیکلز کی ایڈیٹنگ میں مصروف رہتی ہے اور اِس سارے کام کے دوران وہ اکثر و بیشتر جذباتی طور پر بھی سماجی مسائل میں الجھ کر بلکہ تھکا دینے کی حد تک اپنے کاموں میں ایماندارانہ حد تک مصروف رہتی ہے فاطمہ کی شخصیت کا دوسرا اہم پہلو اُس کی رومانوی زندگی ہے۔ وہ اسد سے بے انتہا پیار کرتی ہے اور اس کا اور اسد کا تعلق سنجیدہ حد تک بھی ہے یعنی اُن کے تعلقات میں عشق کی پاکیزگی بھی اور ذہنی آہنگی بھی ہے۔

جس دوران دونوں کی گفتگو کی خاطر اُن کے درمیان رابندر ناتھ ٹیگور اور پروین شاکر کی نظموں کے تبادلے بھی ہوتے ہیں اور ذہنی ملاقات کِی خاطر سماجی و سیاسی مسائل پر بات چیت بھی ہوتی ہے۔ فاطمہ کی شخصیت کا تیسرا ڈائمنشن اُس کی سہیلیوں اور اُن کی فیمیلیز سے تعلق بھی ہے یوں ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ فاطمہ ایک مکمل پروٹوگونسٹ ہے جو ایک توازن کے ساتھ ناول کے مرکزی حصے میں

بر اجمان ہے اور ناول کا سارا بوجھ اپنے کندھوں پر خوش اسلوبی کے ساتھ اٹھا کر ایک توازن کے ساتھ اپنی منزل کی طرف چل رہی ہے۔

اس توازن کو پہلا دھچکہ اُس کی مری ہوئی ماں کی ڈائری کے کچھ صفحات اور تصاویر کے ملنے سے پڑتا ہے۔ اور یوں فاطمہ کے توازنی کردار کے لئے آزمائش کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے یہ آزمائش صرف فاطمہ کے لئے نہیں بلکہ ناول کا مطالعہ کرنے والے قاری کے لئے بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنی تمام تر آئڈیالوجیز کے پس منظر کے ساتھ مستقل اختلافات کا بھی شکار ہوتے ہیں مگر جب فاطمہ کا سفر اُس کے منطقی انجام تک پہنچتا ہے تو قاری بھی اپنے شعور کا سفر اُس کے ساتھ ساتھ ہی ختم کرتا ہے یعنی یہی وہ مقام ہوتا ہے جہاں فاطمہ اور قاری کی یکساں یا مختلف منزل کا تعین ہوتا ہے۔ جس کا اندازہ ظاہر ہے صرف قاری کرتا ہے۔

فیصل عظیم اِس شاہکار اور عظیم ناول کے متعلق رائے دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ :-

> ”اِس ناول کا اصل موضوع تو مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور اس سے جڑے فوجی تنازعات اور مظالم کی روداد ہے لیکن اس کی طرف کہانی جس انداز سے جاتی ہے بظاہر اصل موضوع جنگی جرائم اور جنگوں میں ہونے والا جنسی استحصال معلوم ہوتا ہے مگر کہانی کے اختتام پہ پوری طرح یہ راز کھلتا ہے کہ یہ دراصل اُس کے ذیلی موضوع تھے۔ بات کراچی میں مقیم پرانی یہودی اور یورپی

آبادی کے ذکر سے شروع ہوتی ہے جو غالباً انگریزوں کے ہندوستان میں آکر آباد ہوئے تھے"۔

اس کے دو مرکزی کرداروں میں ایک صحافی لڑکی فاطمہ ہے جو واحد متکلم ہے جبکہ دوسری ایک یورپی یہودی عورت ذوسیہ ہے جو کبھی زندگی کی تلاش میں یہاں آکر بس گئی تھی۔ فاطمہ جس کی ماں بنگلا دیش بننے کے بعد صرف اپنی بیٹی کے ساتھ پاکستان آبسی تھی۔ وہ اپنی محروم ماں کی چیزوں میں موجود ایک یورپی لڑکے کی تصویروں کا راز کھوجتے کھوجتے اپنے خاندانی معاملات کی گرہیں کھولنا شروع کرتی ہے اور پھر ان میں الجھ کر رہ جاتی ہے اور اِسی دوران وہ ہمیں پوری کہانی سنا دیتی ہے۔

اس ناول کا اصل موضوع اگرچہ نیا نہیں مگر پاکستان کے تناظر میں دیکھیں تو بنگلہ دیش بننے کے عمل میں جو الزامات پاکستانی فوج پہ لگتے ہیں ان پر لکھ کر پاکستانی قاری کے سامنے رکھنا آسان کام نہیں ہے۔ اس پر براہ راست تحریر آپ کو ادب اور سیاست کی خارزار سرحد پر پہنچا سکتی ہے۔ لیکن مصنف نے اس مسئلے کی پیچیدگی کو جس انداز سے سنبھالا ہے اور اس موضوع کو جیسے نبھایا ہے۔ میں اس کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا اور بے اختیار جی چاہتا ہے کہ:

؎ خوشبو کسی طرح بھی نہ آئی گرفت میں
کیا حسن احتیاط میرے ہم نشیں میں تھا
(شبنم رومانی)

وجہ یہ ہے کہ جس قاری کے لئے یہ کہانی لکھی گئی ہے اگر پلاٹ اور کرداروں کی سطح پر اِس حسن احتیاط کو نہ برتا جائے تو شاید بات اس کے دل تک

پہنچ نہ پائے۔ سو ناول کی خاص بات ہی اُسے اِس طبقے کے لئے قابلِ قبول بنانا ہے۔ سو میرے نزدیک اِس ناول کی ایک بہت اہم خوبی کرداروں کا چناؤ ہے جس میں بہت احتیاط اور زہانت سے کام لیا گیا ہے۔

ناول کے ابتدائی حصوں میں جہاں لڑکی کی ماں کے مشرقی پاکستان سے تعلق کا ذکر ہوتا ہے وہاں اگرچہ کہانی کی سمت کا اندازہ ہو جاتا ہے مگر مصنف کی چابک دستی اور کہانی پر گرفت کے باعث اصل بات وقت سے پہلے نہیں کھلتی۔ شروع میں لگتا ہے کہ فاطمہ کی ماں کا ذوسیہ کے بیٹے سے کوئی جبر تعلق رہا ہوگا۔ مگر بالآخر بات فاطمہ کی نانی تک پہنچ کر مکمل ہوتی ہے۔

اِس ناول میں جنگ کی انسانیت سوزی وحشت اور کمزور طبقوں کے ابتلا کی تصویر کشی کی گئی ہے اور خاص طور سے اس کا جو دورس اثر بچوں، عورتوں اور آنے والی نسلوں پر ہوتا ہے اسے بہت دلسوزی سے تحریر کیا گیا ہے۔

کہانی کا پلاٹ یورپی یہودی اور کشمیریوں کے المیوں پر مشتمل ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قاری کسی الجھن یا نظریاتی اختلاف کے تحت ناول کو بیچ میں چھوڑ کر ناراض نہیں ہو جائے گا بلکہ اُسے پورا پڑھے گا بھی اور شاید اس پر سوچے گا بھی۔

اِس ناول میں اندازِ تحریر کی بات کریں تو احساسات، منظر اور واقعات کے اجزاء کو بہت اہتمام سے استعاروں کی زبان میں بیان کرنا یہ بلند اقبال کے علامتی ناولوں اور انسانوں کا خاص اسلوب ہے۔ انہوں نے ناول کے شروع میں اسے اپنائے رکھا مگر اِسے بہت دیر تک نہیں اپنائے رکھا اور جلد ہی اِس پر قابو پا لیا۔ جو بہت اچھا ہوا کہ اِس طرح ناول بوجھل نہیں ہوا اور یوں قاری کو بھٹکنے سے بھی بچا لیا گیا۔

میرے تجربے کے مطابق ''**کھوئے ہوئے صفحات**'' ایک مکمل ناول ہے جس کی کہانی ، پلاٹ، کردار ، موضوع، مکالمے اور مقامات اُس کے قاری کو بہت آسانی کے ساتھ اپنے اندر سمو لیتے ہیں۔اور یوں قاری کبھی فاطمہ تو کبھی ذوسیہ کا سونوا بن کر ناول میں اپنا سفر مکمل کرتا ہے۔ ڈاکٹر بلند اقبال نے کہانی کے پلاٹ کو اپنی عمومی تخلیقی چابک دستی سے بہت کس کر بُنا ہے۔

اردو ادب کے لحاظ سے یہ ایک اچھوتا ناول ہے جس کی کہانی بیک وقت یورپ سے ایشیاء تک اور پوری ایک صدی کے سفر پر محیط ہے اس ناول میں نثر کے ساتھ ساتھ خوبصورت نظموں کا استعمال بھی ہوا ہے جس سے اُس کی چاشنی میں اضافہ ہو گیا ہے یہ ناول سراسر بالغ قاریوں کے لئے کیونکہ اِس کے کئی ایک مناظر کم عمر بچوں کے مطالعے کے لیے مناسب نہیں ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ بلند اقبال، ڈاکٹر ''ٹوٹی ہوئی دیوار'' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۱۶ء ص ۹

۲۔ ایضاً ص ۴۸

۳۔ ایضاً ص ۵۷

۴۔ ایضاً ص ۱۰۱

۵۔ ایضاً ص ۱۱۷

۶۔ بلند اقبال، ڈاکٹر ''کھوئے ہوئے صفحات'' سانجھ پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۲۱ء ۔ص ۲۶

۷۔ ایضاً ص ۴۱

۸۔ ایضاً ص ۴۷

۹۔ ایضاً ص ۷۱

۱۰۔ ایضاً ص ۸۲

۱۱۔ ایضاً ص ۱۰۱

باب چہارم

ڈاکٹر بلند اقبال بطور مکالمہ نگار

ڈاکٹر بلند اقبال بطور مکالمہ نگار

بد قسمتی سے پاکستان میں مکالمے کی روائیت بے انتہا کمزور ملتی ہے جس کی وجہ سے ایک ایسا معاشرہ تخلیق ہوتا چلا گیا جس میں مغالطے کو زیادہ فروغ ملا۔ ایک ایسا معاشرہ جو سیاسی ، سماجی، معاشی اور مذہبی اعتبار سے مغالطوں کا شکار ہوتا چلا گیا ہو وہاں عموما مسائل کے حل نفسیاتی طور پر ایک تشدد سی فضا میں ڈھونڈے جاتے ہیں۔

یہاں تشدد سے مراد چیخ و پکار یا بلند آہنگ شور اور ہنگامے کے زریعے اپنے موقف کے لیے الزام تراشی، بہتان، جھوٹ وغیرہ کا استعمال ہے۔ اس قسم کی لاتعداد مثالیں ہمیں سوشل اور الیکٹرانک میڈیا کی بحث و مباحث میں عموما دکھائی دیتی ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نفسیاتی طور پر ایک غیر تربیت یافتہ قوم بن چکے ہیں جسے تاریخی پس منظر میں مکالمہ سے آگہی کا موقع نہیں دیا گیا۔

اس سے قبل کہ میں بلند اقبال صاحب کی مکالمہ نگاری اور اس ضمن میں ان کے فن خطابت اور موضوعات پر گفتگو کروں ، میں چاہونگا کہ مکالمہ نگاری کے پس منظر اور مجموعی طور پر ہماری سوسائٹی کو درپیش مسائل اور مکالمے کی ضرورت پر کچھ اظہار خیال کروں کیونکہ اس گفتگو سے ہمیں اندازہ ہو سکے گا کہ آخر بلند اقبال نے مکالمے کو اپنے علمی اظہار کے لیے چنا کیوں مناسب سمجھا اور اس پورے تجربے میں انہیں یا ہمارے معاشرے کو کس حد تک کامیابی میسر ہوئی ؟۔

ہمیں اس بات سے قطعی انکار نہیں کرنا چاہیے کہ ایک سماجی حیوان ہونے کے ناطے مکالمہ یا ڈائیلاگ ہماری بیالوجیکل ہیت یا فطرت کا ایک حصہ ہے اور ایک

تہذیبی سماج کا قیام کم و بیش ہر سطح پر مستقل مکالمے کی ضرورت کو محسوس کرتا ہے۔ مکالمے کی بنیادی شرائط میں ایک تہذیبی علمی فضا کا ہونا ضروری ہے جس دوران فریقین باہمی احترام کے ساتھ ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو تحمل، برداشت اور غور و فکر کے ساتھ سن کر اپنی رائے کا اظہار کریں۔

اس دوران شریک گفتگو کو ایک دوسرے کو علمی اعتبار سے ہم رتبہ سمجھنا ایک بنیادی ضرورت ہے ورنہ مکالمہ کی ساخت کا پیدا ہونا یا نشوونما پانا کم و بیش ناممکن ہے ایسی صورت میں گفتگو، مکالمے کے بجائے خود کلامی، بیان، واعظ یا تقریر کی صورت اختیار کر جاتی ہے اور اس کے اثرات سراسر زائل ہو جاتے ہیں۔

ایک شراکتی مکالمہ کے دوران فریقین کا موضوعات کے اعتبار سے نہ صرف علمی اعتبار سے بڑی مقدار میں واقفیت کا ہونا ضروری ہے بلکہ دلائل اور شواہد کے استعمال میں بھی تربیت یافتہ ہونا ضروری ہے اور ان دونوں عوامل کے پس منظر میں دانشورانہ ایمان داری اور غیر جانبداری کے ساتھ فکری مسائل کا مشترکہ لائحہ عمل کا مرتب کرنا بے انتہا ضروری ہے تاکہ ایک سیر حاصل مکالمے یا گفتگو کے سبب ایک صحت مندانہ نتیجہ برامد ہو سکے۔

تاریخی اعتبار سے اگر مطالعہ کیا جائے تو مکالمہ کی اہمیت افراد اور گروپ سے بڑھ کر اقوام اور تہذیبوں کے درمیان یکسانیت، یک جہتی اور انسانیت کے زریں اصولوں پر قائم معاشرے کا پتہ دیتے ہیں مگر اس کے سفر کے امکانات ہمیشہ سے انسانوں کے مجلسی مزاج اور اس کے تہذیبی رویے میں ہی ملتا ہے۔

چاہے وہ پتھر کا ابتدائی انسانی معاشرہ ہو جب انسان بنیادی ضرورتوں کے خاطر آگ کی تلاش اور پہیے کی ایجاد کے خاطر الفاظ اور لغت سے قطع نظر ایک

دوسرے کے خیالات اور تجربات کے اشتراک سے اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا تھا یا قدیم یونانی تہذیبی دور کا معاشرہ، جب انسان اپنی ذات اور سماج کے شعور کے خاطر فلسفیانہ مکالمے میں مصروف تھا جس کے اثرات آج کے سائنسی تہذیب یافتہ معاشرے کی صورت میں ملتے ہیں۔

وہ معاشرے جہاں مکالمے کے کلچر کو فروغ ملا وہ تہذیبی طور پر ترقی یافتہ ہوتے چلے گئے چاہے وہ معاشی مسائل ہو یا سماجی، یا مذہبی یا سائنسی، ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اقوام اپنے مسائل سے جامع طور پر نبرد آزما ہو کر بہتر سے بہتر حل ڈھونڈتے ہیں اور گفتگو کے عمل کو مسلسل اور مستقل جاری رکھتے ہیں۔ ایسے معاشروں میں عموما افراد کی زندگی زیادہ سہل اور پرآسائش نظر آتی ہے۔

جبکہ وہ معاشرے جو فاشزم یا مطلق العنانیت کا شکار ہوئے اور جہاں طاقت اور زور زبردستی سے خودسر، بے باک اور مختار کل جیسے حکمرانوں نے اپنی عوام الناس کو کنٹرول کیا اور مکالمے کے بجائے فکری اظہار پر پابندیاں لگائیں وہاں کی عوام سماجی مسائل کا شکار ہوئی۔

ایک ایسے معاشرے میں جہاں جمہوری ماحول کی تشکیل میں سیاسی اور عسکری حربے استعمال ہوئے اور غیر جمہوری عمل کو جمہوری پردے میں پروان چڑھایا گیا اور بیوروکریٹک اور فیوڈرل طاقتوں نے حکمرانی کے خاطر اپنی عوام کو مستقل گمراہی میں رکھا وہاں سیاسی، سماجی اور معاشی حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ ایسے مجرمانہ حکمران سازشی انداز سے مذہبی اور نسل پرستانہ تحاریک کی سرپرستی کر کے عوام میں مثبت مباحثوں، ڈائیلاگ یا مکالموں کے بجائے الزامات و دشنام نفرت اور دوری جیسے عوامل پیدا کر کے اپنا الو سیدھا کرتے ہیں۔

ایسے حالات میں صحت مندانہ ماحول میں مکالمہ اور گفتگو اُن کے لیے سخت نقصان زدہ ہو سکتا ہے اس کے خاطر وہ روائت پرستی اور نئے خیالات کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔ بد قسمتی سے پاکستان کے سیاسی و سماجی اور معاشی، مذہبی و قومی ارتقا میں اسی قسم کی فضا ملتی ہے۔ اس فضا میں مجرمانہ منصوبہ بندی سے مکالمے کی مستقل طور ممانعت کی گئی بلکہ پابندی لگادی گئی اور ایک تاریک سفر کا آغاز کیا گیا جس سے مکالمے کا نہ صرف قتل ہوا بلکہ نفسیاتی طور پر بھی ایک ایسی مجہول اور خستہ حال نسل پیدا ہوئی جس نے غور و فکر اور اظہار کو ہمیشہ قومی اور مذہبی وقار کے منافی سمجھا۔

اِس مجرمانہ سیاسی حکمت عملی کے نتائج میں ملک کے ایک مخصوص طبقے کو تو فائدہ پہنچا مگر پاکستان کی قومی و مذہبی وحدت پارہ پارہ ہوگئی، عوام الناس صوبائی، نسلی، مذہبی اور لسانی تقسیم کا شکار ہوگئی اور ملک معاشی بدحالی کے سپرد ہوگیا۔

فکری مکالمہ کی تربیت نا ہونے کی وجہ سے عوام الناس اس لائق بھی نہ رہی کہ وہ اپنی غربت اور معاشی بدحالی کا سبب جان سکے اور اب حالات یہ ہیں کہ وہ اپنے مسائل کو انہیں بدترین حکمران طبقے کے سیاسی و سماجی بتائیں گئیں وجوہات کو حقیقی جان کر قبول کر لیتے ہیں، یہ سارا نتیجہ ان کی سیاسی و سماجی بصیرت کی غیر موجودگی کی وجہ سے پیدا ہوا ہے اور بد قسمتی سے عوام الناس کو اس بصیرت کے نا ہونے کا بھی علم نہیں ہو رہا ہے اس لیے پاکستان کے سماج میں دور دور تک کہیں کوئی روشنی کا امکان نہیں نظر آرہا ہے۔

ڈاکٹر بلند اقبال کے فکری مکالمے، اس گھٹن زدہ ماحول میں تازہ ہوا کے جھونکے کا سبب بنے ہیں۔ ان کے مکالمے پاکستان کے ان چند لوگوں کے لیے امید کی کرن کا سبب بنے جو اس روائتی سماج کے ماحول میں زندہ تو تھے مگر لب کشائی اور

اظہار کی آزادی کے لیے ترس رہے تھے، ان کے مکالموں کی نشست نے لوگوں کو شعوری بینائی عطا کی اور وسیع علمی و فکری زاویے عطا کیے۔

بلند اقبال کے مکالموں کو ہم مجموعی طور پر فلسفیانہ، نفسیاتی، مذہبی و غیر مذہبی، سیاسی اور ادبی موضوعات کے لحاظ سے تقسیم کر سکتے ہیں۔ ان موضوعات کا تعین مختلف تاریخی اور جغرافیائی حدود میں رکھ کر بھی کیا جاسکتا ہے اور انہیں مختلف سیاسی و سماجی تحاریک کے پس منظر میں بھی گفتگو کی زینت بنایا جاسکتا ہے۔ ان مکالموں کی روشنی میں بلند اقبال کے اپنے شعوری سفر کی بھی ایک تفہیم دستیاب ہو جاتی ہے کہ بلند اقبال کا علمی و فکری سفر دور حاضر کے سیاسی، ادبی، مذہبی و سماجی مسائل پر گفتگو سے شروع ہو کر اپنا دائرہ وسیع کرتا ہے اور تاریخ اور جغرافیہ کے سفر سے ان مقامات تک پہنچتا ہے جو ان مکالموں کے پس اور پیش منظر کا تعین کرتے ہیں۔

اس دوران وہ مختلف اہم علمی شخصیات کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں اور مکالمے کی فضا میں اُس تہذیب کا پتہ دیتے ہیں جو مکالمے کے لیے بنیادی شرط ہے یعنی باہمی احترام کے ساتھ اپنے فریق کے نقطہ نظر کو تحمل، برداشت اور غور و فکر کے ساتھ سن کر اپنی رائے کا اظہار کرنا اور شریک گفتگو کو ہم رتبہ سمجھ کر پورے وقار اور عزت کے ساتھ ہم کلام ہونے کا ہنر شامل کرنا ہے۔ اُن کے مکالموں میں خود کلامی یا واعظ کی کمزوری نہیں ملتی ہے اور نہ ہی وہ گفتگو کے دوران دانشورانہ خیانت کا شکار نظر آتے ہیں۔

عمومی طور پر ہمارے معاشرے میں چند کتابیں پڑھ لینے کے بعد لوگ خود کو دانشور اعظم سمجھنے کے خبط میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اس معاملے میں بلند اقبال کے

پاس بلوغت کے امکانات ملتے ہیں او اُن کی کم و بیش ہر ایک گفتگو یا مکالمے میں ان کا انداز قطعی طور پر عاجزانہ، طالب علمانہ اور حلیمانہ ملتا ہے جس کی وجہ سے ان کی جانب سے مکالمے کے بہت ہی مثبت اثرات اپنے سامعین اور قاری کو ملتے ہیں اور ایک اجتمائی سماجی شعور نصیب ہو جاتا ہے

موضوعات کی روشنی میں بلند اقبال کے مکالمات

- سیاسی شخصیات، کتب اور مسائل
- سماجی شخصیات، کتب اور موضوعات
- ادبی شخصیات، کتب اور موضوعات
- تہذیب اور کلچر کے عنوانات، کتب اور شخصیات
- تاریخ کے پس منظر میں پاکستان کے مسائل
- فلسفیانہ و نفسیاتی موضوعات، شخصیات اور نظریات
- مذہبی و غیر مذہبی نظریات، شخصیات اور کتب

اردو ادب کے اعتبار سے بلند اقبال کے مکالمات

- دور قدیم میں دانائی کا سفر
- قرون وسطی میں دانائی کا سفر
- دور جدید میں دانائی کا سفر

تحاریک اور نظریات کے پس منظر میں بلند اقبال کے مکالمات

- پر تشدد سیاسی انقلابی تحاریک اور نظریات
- نوبل انعام یافتہ شخصیات اور ان کے نظریات
- حقوق نسواں کی تحاریک اور شخصیات
- دنیا کی اہم کتابوں اور نوبل انعام یافتہ ناول
- مغربی ادب کا تاریخی سفر اور سیاسی و سماجی پس منظر

موضوعات کی روشنی میں بلند اقبال کے مکالمات

موضوعات کی روشنی میں جب ہم بلند اقبال کے مکالموں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ایک وسیع موضوعات سے سابقہ پڑتا ہے۔ یہ موضوعات علمی اعتبار سے سماج کے کم و بیش تمام موضوعات کا احاطہ کرتے ہوئے ملتے ہیں۔ ان موضوعات کا انتخاب نہ صرف ان کی سماجی آگاہی کا پتہ دیتے ہیں بلکہ ان کے سامعین، قارئین اور ناقدین کے لیے بھی ایک عقلی چیلنج کا سبب بھی بنتے ہیں اور مستقل علمی بحث کا سبب بنتے رہتے ہیں۔

ان کے موضوعات کو پر لطف انداز میں سمجھنے اور اُس میں حصہ لینے کے لیے قاری کا ایک علمی، عقلی اور شعوری معیار کا ہونا شرط ہے۔ ان کے سیاسی موضوعات میں پاکستان کے حوالے سے نسلی، مذہبی، صوبائی، قومی اور لسانی مسائل پر سیاسی تاریخ کے پس منظر کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور پاکستان کے دیگر ممالک کے ساتھ تعلقات اور موجودہ خارجہ و داخلی مسائل کو سمجھنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔

اس ضمن میں گفتگو کے لیے علمی شخصیات کے انتخاب کا خاص خیال رکھا گیا ہے تاکہ ان نازک موضوعات پر دانشورانہ انصاف سے گفتگو ہو اور مکالمے کی علمی و تہذیبی فضا بھی قائم و دائم رہے، یہی وجہ ہے کہ ان مکالمات کے دوران ایک علمی و تہذیبی معیار یا کلچر کا مستقل اندازہ ہوتا رہتا ہے اور قاری گفتگو کے دوران مسلسل لطف اندوز بھی ہوتا ہے۔ سیاسی اور موضوعات پر بلند اقبال کے چند موضوعاتی سوالات درجہ ذیل ہیں جن سے ان کا مکالمات کے لیے علمی فکر کی سنجیدگی کا اندازہ ہو جاتا ہے:

- پاکستان کی سیاسی فضا میں کمیونزم کے امکانات کیوں محدود رہے؟
- پاکستان کی سیاسی تاریخ میں نسلی و صوبائی محرکات کو کیسے اور کیوں استعمال کیا گیا؟
- پاکستان کی سیاسی دنیا کی ایک مخصوص سمت متعین کرنے کے خاطر تاریخ کے علم کو کس طرح اور کیوں مجروح کیا گیا؟
- پاکستان کو ایک ملٹری اسٹیٹ کی شکل کیوں اور کیسے دی گئی اور اس سے بین الاَقوامی سطح پر پاکستان کو کیا نقصان پہنچا؟
- پاکستان میں مذہبی اداروں خصوصاً مسجد کو سیاست سے کیوں اور کن عوامل کے خاطر منسلک کیا گیا اور اس سے اسلام کی پرامن روح کو کیا نقصان پہنچا؟
- پاکستان کی کمزور داخلی اور خارجہ پالیسی کے نتیجے میں اسے بین الاَقوامی سطح پر کن مسائل کا سامنا کرنا پڑا؟
- پاکستان کو کس منصوبے کے تحت ایک 'سنی اسٹیٹ' بنادیا گیا اور اس سے پاکستان سیاسی طور پر ایک انتہاپسندانہ اسٹیٹ کا تعارف کیسے بنتی چلی گئی؟
- پاکستان کو لسانی بنیادوں پر کس طرح سے تقسیم کیا گیا اور اس کے سیاسی فائدے اٹھائے گئے؟
- پاکستان معاشی طور پر تباہی کے کنارے پر کس طرح پہنچا اور اس کا سیاسی مستقبل مخدوش کیوں ہوتا چلا گیا؟

- پاکستان بین الاَ قوامی طور پر جغرافیائی اور سیاسی مسائل کا حصہ کس طرح بنا اور کیسے استعمال ہوا؟
- پاکستان میں ڈیموکریسی کی اصل شکل کس طرح مجروح کی گئی اور آرسٹوکریسی کیوں اور کیسے پریکٹس ہوئی؟
- پاکستان کی سیاسی تاریخ میں فیوڈل ازم، بیوروکریسی، عدالتی نظام اور عسکری قوتوں نے کس طرح اپنا کردار ادا کیا اور عوام الناس میں سیاسی شعور کو بیدار کرنے میں کیوں مشکلات پیدا کی گئی؟
- پاکستان کے سیاسی، سماجی اور معاشی مشکلات کے اسباب اور ان کا حل کیسے ممکن ہے؟
- پاکستان کی عوام اور اسٹیٹ کا مستقبل کیا ہے؟ پاکستان کی سیاسی و معاشی بہتری کس طرح کے انقلابی فیصلوں اور کوششوں سے ممکن ہے؟

مندرجہ بالا موضوعات سے بلند اقبال کی سیاسی فکر اور سنجیدہ گفتگو کا پتہ چلتا ہے کہ وہ ان موضوعات کی بنیاد پر گفتگو کر کے مسائل کی علمی نشاندہی کر رہے ہیں اور اُس کے حل کے لیے ایک سنجیدہ کوشش کے درپے ہیں۔ ان موضوعات پر گفتگو محض بحث مباحثے یا لفظوں کی تکرار نہیں ہے یا دورانِ گفتگو، الزام تراشیاں اور نفرت انگیز یک طرفہ موضوعاتی بحث سے سابقہ نہیں پرتا ہے بلکہ تاریخ کے تناظر میں ایک سنجیدہ علمی مکالمہ ملتا ہے جس سے گزر کر سامعین کو مسائل کی گہرائی اور گیرائی کا نہ صرف اندازہ ہوتا ہے بلکہ ان مسائل کے حل کے لیے ایک تفکرانہ خیال بھی پیدا ہو جاتا ہے۔

بلند اقبال کے لیے ان گفتگو اور مکالموں کا مقصد یہی ہے جس میں وہ مستقل کامیاب ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ بلند اقبال کے سماجی موضوعات، اخلاقیات اور مذہب کے ربط اور انسانی سوسائٹی میں ان کی حقیقی موجودگی اور غیر موجودگی یا امکانات پر بحث کرتے ہوئے ملتے ہیں۔

نظریاتی بنیادوں پر قائم معاشرے، انسانیت کے لیے ایک بہتر سماج بننے میں کیوں کر ناکام رہے؟ جیسے اہم علمی موضوع کو اگر وہ ایک سمت میں گفتگو کا حصہ بناتے ہیں تو دوسری جانب مذاہبی نظریات کے درمیان ٹکراؤ سے سماجی رویوں کو نقصان پہنچنے پر بھی بحث کرتے ہوئے ملتے ہیں۔ کسی بھی سماج میں زبان، مذہب اور رسوم و رواج کو سیاسی ہتھیار کے طور پر سماج میں کس طرح سے استعمال کیا اور دنیا بھر میں انسانوں کی نفسیات کی کس طرح سے ایک مخصوص رخ میں پرورش کی گئی؟

یہ وہ موضوعات ہیں جو کسی بھی سنجیدہ ادبی رسالے میں دقیق گفتگو کی صورت میں عموماً میسر ہوتے ہیں مگر عام سہل زبان میں براہ راست عوام الناس سے مخاطب ہوتے ہوئے نہیں ملتے ہیں یہی وجہ ہے کہ عوام الناس کا شعور علمی اعتبار سے متزلزل ہو جاتا ہے اور معاشی انداز کی طرح انٹیلکچوئل یا دانشمندانہ کلاسسز کی بھی تقسیم کا شکار ہو جاتا ہے۔

بلند اقبال معاشرے کی اس علمی و شعوری تقسیم کے خلاف دکھائی دیتے ہیں اس کی وجہ ان کا اشتراکی فکری ذہن ہے جو نہ صرف معاشی بلکہ علمی و عقلی لحاظ سے بھی معاشرے کی تقسیم کے خلاف ہے۔ ان کے سماجی موضوعات کا اندازہ مندرجہ ذیل سماجی موضوعات سے ملتا ہے:

- دنیا کی مختلف تہذیبوں کا ٹکراو
- مغربی دنیا کا سرمایہ دارانہ معاشرہ
- مسلم سوسائٹی کا مغربی معاشرتی قدروں سے ٹکراو
- نوآبادیاتی ہندوستان اور پاکستانی علاقوں کا تہذیبی ارتقاء
- پاکستانی کلچر کا تعین اور تاریخی حقائق
- تہذیبی ارتقا میں لسانی مسائل
- انسانی سماج اور ہجرت کے مسائل
- گلوبل سوسائٹی اور سماجی و معاشی محرکات
- سماج سے غربت اور غلامی کا خاتمہ
- پدرانہ سماج اور معاشی مسائل
- سماجی و تہذیبی اقدار اور ٹکنالوجیکل دنیا
- انتہا پسندانہ مذہبی و قومی مسائل اور پُر تشدد سماج
- پاکستان میں روائتی اور غیر روائتی تہذیبوں کا ٹکراو

بلند اقبال کے مکالمات سیاست و سماج کی حدود میں رہتے ہوئے ادب کے موضوعات کا بھی احاطہ کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں مگر اس ضمن میں ان کے موضوعات ادب کی عملی حیثیت کا خاص خیال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہاں ان کے موضوعات کا چناؤ ادب برائے ادب سے زیادہ ادب برائے زندگی کے نظریے کے طرف دار ملتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جن ادبی کتابوں اور موضوعات پر وہ بحث

کرتے ہوئے ملتے ہیں وہ براہ راست ہمارے سیاسی و سماجی مسائل اور مذہبی فکر سے ٹکراؤ کی شکل میں دکھائی دیتے ہیں۔

ان کتابوں ، شخصیات اور موضوعات پر بحث کے دوران ان کی سمت مسلسل ایک بہتر اخلاقی انسان، شعور کی تعمیر اور سماج کی بہتری کی جانب ملتی ہے جو ان کے ایک عملی انسان ہونے کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ان کے ادبی موضوعات خود ادب کے اعلی معیار کو چھوتے ہیں کیونکہ وہ خود ایک افسانہ نگار ، ناول نگار اور مضمون نگار ہیں اور مکالموں میں بھی معیاری ادبی فضا کے سختی سے پابند ہیں ۔ ان موضوعات کی علمی و ادبی نوعیت اور گفتگو کا انداز و بیان خاصا پرکشش اور دلچسپ بھی ہے جو اول تا آخر قاری کو فکری رخ میں باندھ کر رکھتا ہے۔

بلند اقبال ایک مکالمہ نگار ہونے کی وجہ سے ادبی گفتگو کو سیاسی و سماجی پہلوؤں سے بھی جوڑتے ہیں اس طرح وہ محض ادب اور لسانیات کے خشک رویوں کا شکار ہونے سے بچ جاتی ہے اور اس میں کئی ایک علمی و فکری امکانات پیدا ہو جاتے ہیں جس سے اُس کا دائرہ خاصا وسیع ہو جاتا ہے۔ بلند اقبال کے مکالمات سے ان کے ادبی رجحانات کا اندازہ ہو جاتا ہے،ان کی ادبی کتابوں، شخصیات اور موضوعات پر اگر ہم ایک نظر ڈالیں تو ہمیں مندرجہ ذیل مکالمات ملتے ہیں:

- ایک سو بدھا۔ مصنف: ستیہ پال آنند
- لے سانس بھی آہستہ ۔ مصنف: مشرف عالم زوقی
- خدا کے سائے میں آنکھ مچولی ۔ مصنف: رحمان عباس
- ایوانوں کے خوابیدہ چراغ ۔ مصنف: نورالحسنین
- تہذیبی نرگسیسیت ۔ مصنف: مبارک حیدر

- چیسنگ اے معراج ۔ مصنف : طارق فتح
- ہیریٹک ۔ مصنف : آیان ہرشی علی
- پاکستان دی گیریسن اسٹیٹ ۔ مصنف : پروفیسر اشفاق احمد
- فرام ہولی وار ٹو گلوبل پیس ۔ مصنف : ڈاکٹر خالد سہیل
- سیکس اور سماج مکالمہ ضروری ہے ۔ مصنف : سعید ابراہیم

ادب کے موضوعات پر بلند اقبال کی گفتگو ان موضوعات کو چھوتی ہے جو طالب علموں کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہے کیونکہ ان کا ماننا ہے کہ ایک غیر جانبدارانہ مزاج اور رویہ ہی ادب کے قاری کی تخلیق اور نشو نما کرتا ہے۔ ان کے مکالموں میں ادبی موضوعات کچھ اس طرح سے ادبی گہرائی اور گیرائی کا احاطہ کرتے ہوئے ملتے ہیں :

- اردو ادب کے قاری پر ادب کے اثرات
- مغربی ادبی دنیا میں اردو ادب کا مقام
- اردو ادب میں خواتین تخلیق کاروں کے موضوعات
- اردو ادیب اور روائتی فکر
- ادیبوں میں اخلاقیات کا فقدان
- اردو ادب اور ادیبوں کی نرگسی نفسیات
- پاکستانی سیاست میں ادیبوں کا کردار
- سیکولر اور ہیومسٹ نظریات اردو ادب میں
- مذہبی اخلاقیات اور اردو ادب
- اردو ادب میں جنسی موضوعات

بلند اقبال کے پسندیدہ موضوعات میں تہذیبی ارتقاء، پاکستانی معاشرے میں کلچر اور رسوم و رواج کا پس منظر اور تاریخی زاویوں پر گفت شنید شامل ہیں۔ وہ پاکستانی معاشرے میں اخلاقیات کے مسائل کو اکثر اپنے مکالموں کا موضوع بناتے ہیں۔ ان کے نزدیک مذہبی معاشروں میں بالخصوص اخلاقیات کی کمی کو پاکستان میں مکالمے کے سپرد نہیں کیا گیا ہے اور اُس پر ایک طویل عرصے سے مجرمانہ خاموشی طاری ہے۔

پاکستانی معاشرے میں بتدریج اخلاقی انحطاط وقوع پزیر ہوا ہے اور اس کی تنزلی کے ذمہ دار نہ صرف عوامی حلقے بلکہ پاکستانی دانشوران بھی ہیں جنہوں نے اس موضوع کو محض مذہبی علماؤں کے سپرد کر دیا اور یوں یہ موضوع ایک اسٹریو ٹائپ بحث سے آگے نہیں بڑھ سکا۔

بلند اقبال کے لیے اخلاقیات کے انحطاط کی جڑیں مسائل انسانی، معاشی مشکلات، سماجی قدروں اور تعلیمی مسائل سے جڑی ہوئیں ہیں جن کے گہرے نفسیاتی اثرات عوام الناس پر پڑ رہے ہیں۔ ان موضوعات پر سیر حاصل گفتگو اور مسائل کی سنجیدہ کوشش کے بغیر اخلاقیات کی بہتری کے امکانات بے انتہا محدود ہیں۔ اس سلسلے میں بلند اقبال نے کئی ایک موضوعات پر بہت جامع علمی گفتگو فرمائی ہے مثال کے طور پر ان کی گفتگو کے موضوعات میں مندرجہ ذیل عنوانات اکثر و بیشتر ملتے ہیں:

- مسلم معاشروں میں اخلاقیات کی تنزلی کی وجوہات
- تعلیم اور شعور کا کمزور ربط
- الیٹرا سک اور سوشل میڈیا اور پاکستانی تہذیب
- نسل پرستی اور قوم پرستی اور اخلاقی مسائل

- پاکستانی معاشرے میں تہذیبی انقلابات
- پاکستانی معاشرے میں فکر اور اظہار کی آزادی کے مسائل

بلند اقبال تاریخ کے پس منظر میں پاکستانی سوسائٹی کو سمجھنے کی کوشش میں مبتلا ہیں۔ اُن کے خیال میں پاکستانی عوام کو کئی ایک سیاسی وجوہات کی بنا پر اصل تاریخی حقائق سے دور رکھا گیا مگر اس سلسلے میں پاکستان کے کئی ایک تاریخ دان اور ادیب بھی دانشورانہ بے ایمانی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ تاریخی حقائق ٹیکسٹ بکس میں ارادتاً شامل نہیں کیے گئے یا توڑ مروڑ کر طالبعلموں کے تدریسی کورسز یا کیریکلم میں شامل کر دیے گئے تاکہ پاکستان کی نئی نسل ایک مخصوص پسماندہ فکر سے باہر نکل کر پاکستانی سیاسی و سماجی مسائل کو سمجھنے سے قاصر رہے۔

ان کا خیال ہے کہ اظہار کی آزادی کے بنا سماجی، مذہبی اور سیاسی مسائل کا حل قطعی ناممکن ہے اسی لیے مکالمے کی اہمیت ترقی یافتہ ممالک میں بنیادی ضرورت سمجھی جاتی ہے۔ انہوں نے پاکستان کے مختلف صوبوں کے سیاسی و سماجی مسائل ہو تاریخ کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی اور اس پر سیر حاصل گفتگو فرمائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے تاریخ کے پس منظر میں کیے گئے مکالمات میں کئی ایک متنازعہ موضوعات بھی مل جاتے ہیں مثلاً:

- پاکستانی اکیڈمکس میں تاریخ کے مطالعے کا فقدان
- مطالعہ پاکستان میں تاریخی حقائق کا مجرمانہ استعمال
- اسلامی انقلاب سے قبل دنیا کی تاریخ
- اسلامی انقلاب کے بعد دنیا کی تاریخ
- سندھ، پنجاب، بلوچستان اور سرحد۔ ماضی، حال اور مستقبل

- بلوچستان ۔ مستقبل کا بنگلہ دیش
- سندھ میں مہاجر آبادیوں کے سیاسی و سماجی مسائل
- مسلم بھائی چارگی ، بنگلہ دیش اور مغربی پنجاب
- پوسٹ نوآبادیاتی ہندوستانی تہذیب تاریخ کی روشنی میں

بلند اقبال کے موضوعات میں مذہبی فکر، مذہبی تاریخ، مذہبی نفسیات، مذہبی اخلاقیات، مذہبی سیاست ، روحانیت اور انسانی نفسیات پر جابجا مکالمے ملتے ہیں۔ وہ مذہبی گتھیوں کو سلجھانے کے لیے تاریخ کے گہرے کنویں میں اترتے ہیں اور اپنے ڈول میں ایسے گراں قدر موضوعات لے کر اپنے مکالمات کا موضوع بناتے ہیں کہ طبیعت عش عش کرنے لگتی ہے۔ ان موضوعات پر گفتگو کا فقدان نظر آتا ہے کیونکہ اس کے لیے روائیت سے بغاوت اور آوٹ آف بکس غور و فکر کی ضرورت درکار ہوتی ہے جو بدقسمتی سے پاکستانی معاشرے میں ناپید ہوتی چلی گئی ہے۔

بلند اقبال کا وسیع مغربی ادب کا مطالعہ اور فلسفے و نفسیات کا مغربی معاشرے پر اثرات کا گہرا مشاہدہ اور علمی پس منظر مذہبی موضوعات کو روائت سے جدا کرتے ہوئے ایک جامع انداز سے مکالمات کے سپرد کرتا ہوا ملتا ہے۔ مذہب ، فلسفے اور تاریخ کے ملاپ سے وہ کئی ایک منفرد موضوعات کا احاطہ کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جیسا کہ :

- مذہبی آئیڈیالوجی میں میٹا فورس کی مادی ساخت
- انسانی نفس ۔ روح یا ذہن
- اسلام ایک مذہبی تصور یا سیاسی تحریک
- اسلام اور استعماریت

- اسلام ۔ پر امن یا پر تشدد مذہب
- مذہبیت، لامذہبیت اور انسانیت
- مذہب اور شعور
- نسل پرستی ۔ خداوند کا تحفہ یا انسانی تخلیق
- حجاب، برقعہ اور مذہبی انتہا پسندانہ رویے
- عیسائی، ہندو اور یہود ۔ مسلمانوں کے دشمن؟
- مذہب اور قومیت کا تصور اور انسانی تحت الشعور
- پاکستان ۔ اسلام کی کھوئی ہوئی منزل
- تبلیغی جماعت، فلسفہ وجودیت اور فائن آرٹ

فلسفہ، ادب اور نفسیات کے موضوعات بلند اقبال کے مکالمات کے اہم موضوعات ہیں۔ انہوں نے تاریخ کے مختلف ادوار میں ان موضوعات کو ایک طویل علمی بحث کے سپرد کیا جس کے نتائج میں ان کے سامعین اور قدردانوں کی ایک بڑی تعداد نے اس میں حصہ لیا بلکہ بعدازاں اُسے ایک علمی دستاویز کی شکل میں پبلش بھی کر دیا۔ بلند اقبال کے یہ مکالمات 'دانائی کا سفر' کے عنوان سے سانجھ پبلشر لاہور سے طویل کتابی شکل میں پرنٹ ہوئی۔

ان مکالموں کی ترتیب و تدوین پنجاب کے دورافتادہ پسماندہ گاوں میاں چنوں کے رہاشی عبدالستار صاحب نے کی جو بلند اقبال کے مکالموں میں سالہا سال سے قاری کے طور پر شریک تھے۔ عبدالستار اپنی ذہنی تربیت میں بلند اقبال کے مکالموں اور گفتگو کو ایک اہم حصہ قرار دیتے ہیں۔ دانائی کے سفر کے دیباچے میں عبدالستار رقم طراز ہیں:

''میں سماجی طور پر ایک ایسے روائتی معاشرے سے تعلق رکھتا ہوں جہاں پر بچپن سے کچھ بندھے بندھائے اور ٹکے ٹکائے اصولوں و ضوابط کی بنیاد پر تربیت کا آغاز کر دیا جاتا ہے۔ بلوغت کی عمر تک پہنچتے پہنچتے بچہ اس روائتی ماحول کا عادی ہو چکا ہوتا ہے اور پھر اس کے لیے اِس روائتی سرکل سے نکلنا کم و بیش ناممکن ہو جاتا ہے۔ ایسے ماحول میں ڈاکٹر بلند اقبال کے مکالمات نے میرے شعور پر بنیادی اور گہرا کردار ادا کیا اور مجھے زندگی کو ایک نئی نگاہ سے دیکھنے کا موقع عطا کیا''

دانائی کا سفر مجموعی طور پر تین ادوار کے لحاظ سے ادب، فلسفہ اور مذہبی و غیر مذہبی فکر کا طویل سفر ہے جس نے انسانی سماج کو قدیم دور سے قرون وسطی میں اور پھر دور جدید میں انسانی تہذیب کو متعارف کروایا ہے۔ اس سفر کے دوران بلند اقبال ان اہم مذہبی اور سیکولر فلاسفرز، سیاسی و سماجی نظریات اور ادبی، نفسیاتی، سائنسی اور فلکیاتی علوم کے موضوعات کو بحث کرتے ہیں جو قاری کے لیے ایک مستقل ترتیب سے انسانی تہذیبی ارتقا کے شعور کا سبب بنتا ہے۔

علمی بحث کا یہ سلسلہ بین المذاہب اور سیاسی و سماجی تحاریک کے درمیان رشتوں پر سے پردے اٹھاتا ہے اور قاری کو مجموعی اعتبار سے انسانی تہذیب میں انسان کے مجموعی کردار کا تفصیل سے تعارف کراتا ہے اور اُس کی نوبل کوششوں کا اعادہ کرتا ہے۔

دانائی کا سفر کا مطالعہ بلند اقبال کی اس تمام علمی کوشش کو دل سے خراج تحسین پہنچانے پر مجبور کرتا ہے کیونکہ اس کتاب کے مطالعے سے بیک وقت ادب، فلسفہ، تاریخ، مذہب اور دیگر سماجی علوم کے درمیان ربط سے آگہی ہوتی ہے اور علم و شعور کے پھیلاو میں مکالمے کا سنجیدہ کردار اجاگر ہوتا ہے۔ دانائی کا سفر کے موضوعات کا احاطہ کچھ یوں ملتا ہے:

دور قدیم میں دانائی کا سفر۔ حصہ اول

- سدھارتھا ہرمن ہیس کا ناول اور مہاتما بدھا کی دانائی (حصہ اول)
- سدھارتھا ہرمن ہیس کا ناول اور مہاتما بدھا کی دانائی (حصہ دوئم)
- کنفیوشس اور اُن کے اخلاقی اقدار (چینی دانائی)
- لاوزی اور داودی چنگ (چینی دانائی)
- رابندر ناتھ ٹیگو اور گیتانجلی (ہندوستانی دانائی)
- کبیر داس کی صوفیانہ دانائی (ہندوستانی دانائی)
- رابعہ بصری کی روحانی دانائی (اسلامی دانائی)
- مغربی فلسفے کی تاریخ (یونانی دانائی)
- پلوٹو کا فلسفہ (یونانی دانائی)
- زرتشت کی مذہبی دانائی (زراتشت ازم)
- مہاتما بدھا کی دانائی (بدھا ازم)
- بھگوت گیتا کی دانائی (ہندوازم)
- مہاویرا کی دانائی (جین ازم)
- عہد قدیم کی دانائی پر ایک مجموعی نظر

قرون وسطی میں دانائی کا سفر۔ حصہ دوئم

- ال کنڈی اور الرازی کی دانائی
- ال فارابی اور بو علی سینا کی دانائی
- غزالی اور ابن الرشد کی دانائی
- ابن تیمیہ اور سید قطب کی دانائی (شدت پسندانہ مذہبی فکر)
- جلال الدین رومی کی دانائی (صوفیانہ مذہبی فکر)
- علامہ اقبال اسلام میں مذہبی فکر کی تشکیل نو (فلسفیانہ مذہبی فکر)
- قرون وسطی میں دانائی کے سفر پر ایک مجموعی نظر

دور جدید میں دانائی کا سفر۔ حصہ سوئم

- رینے ڈیکارٹ اور ڈیوڈ ہوم کی دانائی
- آدم اسمتھ اور جین روسو کی دانائی
- میکس ریبر اور ایمل ڈرکھم کی دانائی
- ہیگل اور کال مارکس کی دانائی
- اینٹینو گرامچی اور لوئی التھیزر کی دانائی
- فریڈک نطشے اور دس اسپوک زرتشترہ
- ژین پال سارتر کا فلسفہ وجودیت
- چارلس ڈارون اور رچرڈ ڈاکنز کی دانائی
- سگمڈ فرائڈ اور نفسیاتی دانائی
- یوہال حراری اور انسانی دانائی کا ارتقائی سفر
- اسٹیفن ہاکینگ کی فلکیاتی دانائی اور وقت کی تاریخ
- دور جدید میں دانائی کے سفر پر ایک مجموعی نظر

دانائی کا سفر جیسی دقیق علمی کتاب اور نایاب پر فکر ڈکمومنٹ پر امجد سلیم منہاس کے خیالات سے بلند اقبال کے مکالمات کی سنجیدہ کوشش کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے مضمون ''مکالمے کی روایت'' میں رقم طراز ہیں:

''اجتماعی دانش میں مکالمے اور رائے کے اظہار سے انکار نے پاکستان کو دو ٹکڑے کرڈالا اور دنیا کے نقشے پر بنگلہ دیش وجود میں آگیا۔ پاکستان کی سماجی، سیاسی،

معاشی اور قومی تشکیل میں ہمیں بہت شروع سے ایک تصادم کی فضاء دکھائی پڑتی ہے۔ اس فضاء میں مکالمے کے بجائے طاقت کے استعمال اور اظہار کو اہمیت حاصل ہے۔ اس دوران دانشور، صحافی، وکلا، ٹریڈ یونینیٹ ، خواتین مزاحمت کے اشارے بن کر ابھرتی رہیں لیکن ایسی تمام آوازوں کو ہماری ریاست مسترد کرکے انہیں یہود و ہنود اور نصاری کے ایجنٹ قرار دیتے رہی۔ اس تاریک سفر نے مکالمے کا خون کر دیا۔ اس فضا میں بلند اقبال اور ڈاکٹر خالد سہیل دانائی کا سفر لے کر حاضر ہوئے ہیں۔ ان دونوں حضرات نے مکالمے کی روایت کو زندہ کرنے کا علم اٹھایا ہے اور اسے صرف پاکستان میں نہیں دنیا بھر میں لہرانے کی بات کررہے ہیں۔ وہ دنیا کے مختلف خطوں ، تہذیبوں اور مذاہب کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی خوبصورتیوں کو بیان کرتے ہیں اور انسانیت کو ان سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب دیتے ہیں۔ ان خوبیوں کو انسان کا اجتماعی شعور قرار دیتے ہیں اور بڑی محبت سے واضع کرنے کی کوشش میں ہیں کہ اس کرہ ارض کے باشندے کس

طرح اس اجتماعی دانش سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں''

دانائی کے سفر میں جہاں فلسفیانہ، نفسیاتی، ادبی، سائنسی و سیاسی تحاریک کا سفر اہم تھا وہیں ان کا امن سے ایک طویل اور گہرا رشتہ ہے۔ بلند اقبال کے خیال میں پاکستانی نئی جنریشن کے لیے خصوصا اور عمومی عوام الناس کے لیے ان شخصیات کی علمی و عملی کوششوں کا ادراک ہونا ضروری ہے جن کی ساری زندگی دنیا میں امن کی جد وجہد میں صرف ہوئی۔ اس جد وجہد کی اصل کامیابی ان شخصیات کے نیک ارادے اور وہ کوشش اور قربانیاں ہیں جس نے ان کو ایک نوبل نام دیا اور ان کی زندگی کو عزت قدر اور توقیر سے نوازا۔ ان کے خیال میں اس کاوش کا نعم البدل دنیا کا کوئی ایوارڈ یا کوئی سرٹیفیکٹ نہیں ہے۔

شائد یہی وجہ ہے کہ بلند اقبال خود بھی کسی تعریف یا ستائش سے بے فکر ہوکر علمی مکالمے جیسی سخت فضا میں ایک مستقل سماجی خدمت میں مصروف ہیں جس کا نیک مقصد ایک پر شعور اور پر امن نئی نسل کی تخلیق ہے۔ جن شخصیات کو بلند اقبال نے اپنے مکالمات کا موضوع بنایا اُن میں مندرجہ ذیل نوبل پیس لاریٹ کے نام ملتے ہیں:

- محمد یونس۔ بنگلہ دیش میں معاشی انقلابی جد وجہد
- شیریں عبادی۔ ایران میں ہیومن رائٹس پر انقلابی جد وجہد
- مارٹن لوتھر کنگ۔ نارتھ امریکہ میں نسلی تعصب کے خاتمہ پر انقلابی جد وجہد
- یاسر عرفات۔ فلسطین میں سیاسی امن کے خاطر انقلابی جد وجہد

- یٹزک رابن ۔ اسرائل اور فلسطین کے درمیان جنگ کے خاتمے پر انقلابی جد وجہد
- نیلسن منڈریلا ۔ جنوبی افریقہ میں سیاسی اور سماجی تبدیلی کے لیے جد وجہد
- فریڈک ویلیم ڈی کلارک ۔ جنوبی افریقہ میں سیاسی اور سماجی تبدیلی کے لیے جد وجہد
- ڈسمنڈ ٹوٹو ۔ جنوبی افریقہ میں سیاسی اور سماجی تبدیلی کے لیے جد وجہد
- عبدالستار ایدھی ۔ پاکستان میں سوشل سروسز کے لیے انقلابی جد وجہد

بلند اقبال نے نہ صرف ان نوبل پیس لاریٹ پر غیر جانبدارانہ انداز سے علمی مکالمے کیے بلکہ ان سیاسی تحاریک پر بھی گفتگو کی جو پر تشدد اور غیر تشدد انداز سے انسانی معاشروں میں عظیم تبدیلیوں کا سبب بنیں۔ ان سماجی انقلابی تحریکوں نے کس طرح سے انسانی سماج کو اپنے ادوار کی سماجی و سیاسی ضروریات کے لحاظ سے متعین کیا اور اُس کے ارتقائی عمل کو ایک مخصوص سفر پر آمادہ کیا، اس بات کا شعور سماجی علم کے طالب علموں کے لیے انتہائی ضروری ہے۔

اس ضمن میں بلند اقبال نے جن تحاریک کو اپنی علمی بحث کا موضوع بنایا وہ مندرجہ ذیل ہیں:

امن کے لیے پُر تشدد اور پُر امن انقلابی شخصیات اور تحاریک

- ولادئمر لینن اور روسی سوشلسٹ انقلاب
- ماوزے ڈانگ اور چاینز کمیونسٹ انقلاب
- ہو چی من اور ویتنام جنگ
- چے گورا اور کیوبا کا انقلاب
- فرینز فینن، پوسٹ کولونیل اسٹیڈیز، پر تشدد انقلابات، کریٹیکل تھیوریز اور مارکس ازم
- لیو ٹالسٹائی اور امن کے لیے پر امن انقلابی جد وجہد
- موہن داس کرم چند گاندھی اور انگلستان سے ہندوستان کی آزادی کے لیے پر امن جد وجہد

بلند اقبال کے مکالموں کا طویل سفر اِن پُر امن اور پُر تشدد تحاریک اور انقلابی جد وجہد پر مکالموں پر ہی نہیں رُک گیا بلکہ سماجی تبدیلی میں خواتین کی جد وجہد خصوصا تحریک نسواں اور اس کے سماجی اثرات پر بحث کو بھی شامل کرتا ہوا ملتا ہے۔ انسانی سماج میں مرد اور عورت کی تخصیص اور تفریق نے منفی فکر کے پدرانہ سماج کو پیدا کیا جس کی ایک طویل انسانی تاریخ ہے۔

بلند اقبال نے مغرب و مشرقی معاشرے میں عورت کے سماجی کردار کو بنا کسی جانبداری سے اپنی بحث کا حصہ بنایا، انہوں نے دونوں سماج میں عورتوں کے سماجی مقام کے تعین پر مکالمہ کیا اور مرد و عورت کی سیاسی، مذہبی اور سماجی فرق اور

برابری کے تصور پر تفصیل سے گفتگو کی۔ اس دوران انہوں نے مختلف تاریخی حقائق اور سماجی نظریات کے تعلق کو بھی اجاگر کیا تاکہ گفتگو کے میلانات، کسی ایک تصور یا زاویے تک محدود ہو کر جانبدارانہ شکل نہ اختیار کر پائیں اور مکالمے کے مدوجہ قوانین کی پاسداری قائم و دائم رہے۔

بلند اقبال نے تحریک نسواں کی جن شخصیات اور تحاریک کے زکر کو اپنے مکالمات میں شامل کیا اُن کے خیال میں ان انقلابی خواتین کی کاوشوں، نظریات، انقلابی فکر اور جد وجہد سے مغرب و مشرق میں عورتوں کی آزادی اور خود مختاری نے اہم ترین کردار ادا کیا ہے۔ اس جد وجہد نے خصوصا مغربی معاشرے میں عورتوں کو مردوں کے برابر معاشرتی مقام عطا کیا ہے۔

سوشلزم، انارکزم، کیپٹل ازم اور ہیومنزم کی آئیڈیالوجی کے پس منظر میں فیمنزم پر کیے گئے مکالمات، اُن کے سامعین کو دانائی کے اس سفر کے دوران نئی فکری جہت عطا کرنے اور ڈائلوگ کی فضا قائم کرنے میں ایک بار پھر کامیاب رہے، اس دوران ان کے موضوعات مندرجہ ذیل خواتین اور تحاریک کا احاطہ کرتے ہوئے نظر آئے:

الزبتھ اسٹینٹن۔

یہاں بلند اقبال مکالمے کی ابتدائی پس منظر میں مذہب اور عورت کے درمیان بیک وقت سگے اور سوتیلے رشتے پر گفتگو کرتے ہیں کیونکہ مذہبی دنیا کی عورت مذہب کے اوڑھنے بچھونے میں اپنی عافیت، اپنی عظمت اور اپنی خوش نصیبی سمجھتی ہے جبکہ غیر مذہبی دنیا کی عورت اِسی مذہب کی بنیادوں میں اپنی تباہی، اپنی

بے ترتیبی اور اسے اپنی بد نصیبی سمجھتی ہے کیونکہ اس کا یہ خیال ہے کہ تہذیبی ارتقاء میں عورت پر مرد کی حاکمیت کی ذمہ داری مذہب کے ایمانی نظریات پر بھی جاتی ہے جس نے دنیا میں اسے 'دوسرے نمبر پر' مخلوق کے عہدے پر فائز کر کے رہتی دنیا تک مردوں کے تابع بنا کر رکھ دیا ہے۔

اُن کی نفسیاتی توڑ پھوڑ اور خود اعتمادی میں کمی کی وجہ خدا کا 'مردانہ' تصور اور 'مردانہ پیغمبرانہ سلسلہ' ہے جس کی وجہ سے وہ بے وقعت سی ہو کر رہ گئی ہے۔ الیزبتھ اسٹینٹن نے اسی وجہ سے عیسیٰ و موسیٰ کی بائبل /توریت کے جواب میں ''وومن بائبل ''لکھ کر عورتوں کی طرف سے احتجاج رقم کرا دیا۔

بیٹی فریڈن :-

بلند اقبال ماڈرن دور کی عورت کے اُس گھمبیر مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے ملتے ہیں جسے مردوں کی دنیا میں کسی بھی 'نام' سے نوازنے کا تکلف نہیں کیا گیا تھا۔ فیمنسٹ رائٹر 'بیٹی فریڈن' نے اس اہم ترین موضوع پر ایک یادگار کتاب 'دی فیمنن مسٹک' لکھی جو اپنے دور میں ایک بیسٹ سیلر بک ثابت ہوئی اور پھر دنیا بھر کی زبانوں اُس کے تراجم بھی ہوئے۔ اس اہم ترین 'گمنام مسئلے' کے علاوہ عورتوں کے تولیدی حقوق ، نوکریوں میں عورتوں اور مردوں کے مساوی حقوق ، سیاہ فام اور لیسبنز یا گیز کے معاشرتی رائٹس جیسے موضوعات پر مستقل مزاجی سے جد وجہد کرنے والی اس فیمنسٹ ایکٹوسٹ کے بارے میں بلند اقبال نے سیر حاصل گفتگو کی۔

اُن کے خیال میں بیٹی فریڈن کا تعلق ان عظیم خواتین میں سے ہے جن کی سنجیدہ جد وجہد سے مغربی معاشرے میں آج عورت اور مرد مساوی بنیادوں پر زندگی گزار رہے ہیں اور مشرقی معاشرے کی عورت بھی آزاد فضا میں سانس لینے کے لائق ہو رہی ہے۔

سمن ڈی بیوا:

بلند اقبال کے مطابق فلسفہ وجودیت اور سوشلزم کو پاکستان میں ایک خاص سیاسی 'شعور' سے برتا گیا اور عوام الناس میں اس مفروضے ہی کو بڑی حد تک حقیقت میں 'کفری فکر' سے تعبیر کیا گیا کیونکہ دونوں ہی افکار، وجودی و معاشی امکانات کے فلسفے کو مادیت کے پیمانوں میں ناپ کر زمینی حقائق میں انہیں ڈھونڈ رہیں تھیں جو ایک مذہبی معاشرے کے انجذاب کے لیے خاصا مشکل مرحلہ تھا۔ دوسری طرف حقوق نسواں کی مغربی تحریک بھی اس صورت حال میں براہ راست ٹکراو کی صورت میں نظر آتی ہے کیونکہ اس کے تانے بانے بھی 'مذہبی نسوانی شکل' کو بڑی حد تک چیلنج کر رہے تھے۔

سمن ڈی بوا، فرانسیسی فلاسفر نے وجودی فلسفے، مذہبی نظریات اور نفسیاتی و معاشی پس منظر میں تاریخ کی روشنی میں عورتوں کی سماجی غیر متوازن حالت کا تفصیلی تجزیہ کیا اور 'دی سیکنڈ سیکس' جیسی ریمارک ایبل کتاب بھی لکھی۔ بلند اقبال نے سمن ڈی بیوا کی معروف کتاب دی سیکنڈ سیکس کو اپنے مکالمے کا حصہ بنایا اور تاریخ کی روشنی میں عورت کے سماجی مقام کا تعین کیا۔

ایما گولڈ مین :

بلند اقبال نے ایما گولڈ من کی زندگی کے پس منظر میں سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت کے حوالے سے تفصیل سے گفتگو کی کہ چند سو برسوں میں یہ دونوں آیڈ یالوجی زکئی ایک سیاسی و اقتصادی محاذوں پر ایک دوسرے کے ساتھ پنجے لڑاتی ہوئے دکھائی دیتیں ہیں مگر ایک بالکل مختلف محاز، جس کے حق میں ایما گولڈ مین جیسی جہاندیدہ عورت لڑتی ہوئی ملتی ہے، 'انارکزم' ہے۔

ایما گولڈ مین آزادی نسواں کی لڑائی میں اس آخری حد تک چلی گئی کہ ان کے خیال میں عورتوں اور مردوں کے برابری کے خاطر سرمایہ دارانہ نظام یا کسی بھی نظام حکومت کا خاتمہ ضروری ہے اور کمیونٹی اور فرد کو اپنی دلچسپی کے لحاظ سے صرف آزادانہ زندگی گزارنے کا حق حاصل ہے اور یوں انہیں زندگی میں کئی بار حوالات کا بھی رخ کرنا پڑا۔ یوں بلند اقبال نے ایما گولڈ مین کی شخصیت،ان کی کاوشوں اور انارکزم کی تحریک پر تفصیل سے گفتگو کی اور سماج میں عورت کے کردار پر ایما کی جد وجہد اور قربانیوں کا زکر کیا۔

آنائیس نن :

بلند اقبال کے مطابق آنائس نن کا شمار ایک ایسی فیمنسٹ رائٹرز میں ہوتا ہے جن کی ڈائریز اور کتابوں نے عورتوں کی مجموعی نفسیات اور خصوصا جنسیات پر نئے نفسیاتی تصورات پیدا کیے اور فیمنسٹ موومنٹ میں نسوانی تصور آزادی پر ایک نئی طرز کی بحث اور دلیل کا آغاز کیا۔

لو سیلون :

بلند اقبال نے لو سیلون کو تحریک نسواں کا ایک اہم کردار قرار دیا۔ اُن کے مطابق وہ بہت ہی متاثر کن رائٹر، ناول نگار، فیمنسٹ ایکٹوسٹ اور ماہر نفسیات تھی جن کی نسوانی سیکچوئیلٹی یا جنسیات پر بہت گہری نظر تھی۔ بلند اقبال کے مطابق لو سیلون نے فریڈک نطشے جیسے فلاسفر کو اپنی کتاب 'ہیم ٹو لائف' سے اس قدر متاثر کیا کہ انہوں نے اس کی میوزیکل کمپوزیشن ترتیب دی اور پھر یہ سلسلہ یہی نہیں رکا بلکہ وہ اس کے عشق میں بھی گرفتار ہوگئے بالکل اسی طرح سگمٹ فرائیڈ جیسا ماہر نفسیات داں بھی لو سیلون کی طلسماتی شخصیت نسوانی نفسیاتی پر انٹیلکچوئل گرفت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

انیسا آرمنڈ :

بلند اقبال نے ۱۹۱۷ کے رشین بولشیوک انقلاب کے دوران ولادمیر لینن کی خوبصورت اور نڈر محبوبہ انیسا آرمنڈ پر بھی مکالمہ کیا جس کا نام اور تذکرہ سیاسی وجوہات کی وجہ سے اسٹالین کی سخت ترین سینسر شپ کی وجہ سے عوام الناس کی نظروں سے جان بوجھ کر اوجھل کر دیا گیا تھا مگر درحقیقت اپنی دلچسپ شخصیت اور انتھک فیمنسٹ جد وجہد کے بدولت وہ نام کبھی بھی روس کے سیاسی اور سماجی منظر نامے سے غائب نہ ہو سکا اور اسٹالین کے بعد ایک بار پھر کسی فلمی ہیروئن کی طرح خصوصا روس کی سماجی دنیا میں پھر سے نمایاں ہوگیا۔ ان کے خیال میں روسی انقلاب میں انیسا کی جد وجہد کو نظرانداز کرنا قطعی ناممکن ہے۔

جرمین گریر:

بلند اقبال نے آسٹریلین رائٹر اور پبلک انٹیلیچوئل جرمین گریر فیمنسٹ موومنٹ کی شدت/بنیاد پسند (ریڈیکل) تحریک سے وابستگی پر مکالمے کا بندوبست کیا کیونکہ بلند اقبال کے مطابق جرمین کا خیال تھا کہ عورتوں کو اندازہ ہی نہیں کہ مرد انہیں کس قدر خود سے کمتر سمجھتے ہیں۔ جرمین گریر کی بیسٹ سیلر بک 'دی فیمیل یوسک' تھی جبکہ یوسک کا مطلب کاسٹریٹڈ (درمیانی جنس) سے لیا جاتا ہے تو اُن کی کتاب کے نام سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ جرمین گریر کے مطابق مردوں نے عورتوں کو سوسائٹی میں 'بے وقعت' بنا دیا ہے اور اس ساری نفسیاتی و سماجی بربادی میں خود عورتوں نے ہی مردوں کا ساتھ دیا ہے کیونکہ وہ صدیوں کے پدرانہ تہذیبی سفر میں ذہنی طور پر 'یوسک' ہو چکی ہیں یعنی کسی بھی مزاحمت سے عاری ہو چکی ہیں۔

وہ انسانی سوسائٹی میں اپنے دوسرے یا ادنی درجے کے مقام پر راضی ہو چکی ہیں۔ اس تاریخی پراسس یا عمل میں مردوں نے اپنے دیے گئے سیاسی، سماجی، مذہبی اور نفسیاتی نظریات سے پوری طرح فائدہ اٹھایا۔

ایڈرے لارڈ:

بلند اقبال کے مکالموں کے دوران ہماری نظر ایڈرے لارڈ کی نسائی حقوق کے لیے جد وجہد پر بھی آکر رُک جاتی ہے کیونکہ اس طرح سے ہمیں فیمنزم یا تحریک نسواں میں اندرون خانہ چلنے والی رنگ اور نسل کی بنیاد پر تفریق بھی نظر پڑتی ہے اور بلیک عورتوں کا تحریک نسواں میں ایک منفرد اور طاقتور شئیر بھی دکھائی دیتا ہے۔ بلند اقبال ایڈرے لارڈ کے پس منظر میں جنس، کلاس اور سیکچوئیل خصوصالیز

ہزم کے حوالے سے فیمینزم مومنٹ پر روشنی ڈالی ہے جو بلاشبہ ایک دلچسپ موضوع ہے اور امریکی معاشرے کا ایک اہم ایشو بھی ہے۔

فرید افرام:

بلند اقبال کے مطابق فیمنسٹ موومنٹ کی تاریخ میں ہمیں کئی ایک باہمت انقلابی خواتین نظر آتی ہیں جو ادب، سیاست ، سائنس اور فلسفہ کی دنیا میں مردوں کے شانہ بہ شانہ متحرک رہتے ہوئے دنیا بھر میں عورتوں کے سماجی مقام کو متعین کرنے میں کامیاب ہوئیں۔ فرید افرام رچمن جرمنی کی پہلی خاتون تھی جنہوں نے میڈیسن میں بیچلر کرنے کے بعد نفسیات میں اسپیشلائزیشن کی اور شیزوفرینیا، بائی پولر ڈس آرڈر اور ڈپرشن کے علاج کے نئے طریقے علاج دریافت کیے اور ان موضوعات پر یادگار کتابیں لکھیں۔

فلورنس نائٹ اینگل:

جنہوں نرسنگ کے شعبے میں انقلابی جد وجہد کی اور انسانی خدمت میں عورتوں کے عظیم مقام کو متعین کیا۔

بلند اقبال کے علمی مکالموں میں مغربی ادب خصوصا ناول نگاری پر جابجا مکالمے ملتے ہیں۔ ان کے موضوعات میں مغرب کا کلاسک ادب خصوصا ڈسکشن کا سبب بنا ہے۔ بلند اقبال کے مطابق دنیا کے بہترین لکھے گئے ادب انسانی ذہن کے گہرے ترین خلیات پر اثر کرتے ہیں اور سوچ کے امکانات کو جیومیٹری کے کمپاس کی طرح ہر سمت میں پھیلا رہتے ہیں۔

دوستوویسکی، نطشے، سارتر اور البرٹ کامو وہ ادیب ہیں جنہوں نے فلسفہ وجودیت کی کم و بیش ہر ایک جہت پر خوب ہی لکھا اور انسانی فکری سمت کو ۳۶۰ ڈگری سے کہیں زیادہ گھما کر نئی راہیں پیدا کی۔

بلند اقبال اپنے مکالموں میں البرٹ کامو کے مشہور ناول 'اسٹرینجر' یا 'اجنبی' کے فلاسفر یکل امکانات پر گفتگو کی جس نے مغربی سماج پر اپنے گہرے اثرات مرتب کیے اسی طرح انہوں نے ژان پال سارتر پر گفتگو کی جنہوں نے فلسفہ وجودیت کے پس منظر میں زندگی کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے اپنے ناول اور ڈراموں میں انسانی کرداروں کو شعور دے کر ایک نئی ادبی دنیا کی تخلیق کی۔

بلند اقبال کے لحاظ سے زندگی یا کائنات کا یہ فلسفیانہ رخ ہمیں ایک ایسی شعوری و لاشعوری دنیا میں لیجاتا ہے کہ جس میں اترنے کے بعد ہمارا اپنے آپ کو اور اپنی دنیا کو دیکھنے اور برتنے کا سارا نظریہ ہی بدل جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں ژان پال سارتر کا ناول 'نازیا' محض ایک یا چند کرداروں کی کہانی نہیں ہے بلکہ تمام تر انسانی شعور اور آگہی کا قصہ ہے۔ نازیہ کے علاوہ بلند اقبال فرینز کافکا پر مکالمے کا بھی اہتمام کرتے ہیں ان کے مطابق:

> ''فرینز کافکا کا جملہ ہے کہ اگر کوئی کتاب کسی ہتھوڑے کی طرح ہمارے سر سے ٹکرا کر ہمیں جگا نہ سکے تو ایسی کتاب پڑھی ہی کیوں جائے؟ کافکا نے اپنا ریمارک اپنے ناول 'دی ٹرائیل'، ۱۹۱۴ء-۱۹۱۵ء کے دوران تخلیق کیا تھا، انہوں نے اپنی موت سے قبل اپنے دوست میکس براڈ کو اپنے تین نامکمل ناولز

دی ٹرائیل، ایمریکا اور دی کیسل کو جلا کر ضائع کرنے کی تاکید کی تھی مگر براڈ نے اپنے تئیں اس بات کو تخلیقی ادب میں خیانت سمجھ کر انہیں پبلش کروادیا اور یوں ان ناولز کی اشاعت نے بیسویں صدی کے ایک انتہائی منفرد ادیب سے مغربی و مشرقی ادبی دنیا کو متعارف کرادیا۔ یہ کتابیں جو اگر جل جاتیں تو ادب کے قاری فلسفہ بیزارگی، وجودیت کے احساس سے پیدا ہونے والی اضطرابی کیفیت ,احساس حرم و شکست وریخت اور بے معنویت جیسے پیچیدہ موضوعات پر لکھے گئے بہترین ادب سے محروم رہ جاتے۔ 'دی ٹرائیل' کافکا کی ایک مکمل کہانی نہیں تھی مگر اس ناول کا ایک چیپٹر ناول کی کہانی کے منطقی انجام کو ضرور ظاہر کرتا ہے اور اس لحاظ سے کافکا کی کہانی 'دی ٹرائل' کے لاشعوری تخلیقی انجام کو بھی ۔۔ مگر جب ہم اس ناول کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ناول کی بنت ،کردار نگاری اور تھیم سے کافکا کے فہم کی گہرائی کا باخوبی اندازہ ہوجاتا ہے۔ آج کے مکالمے میں ہم کافکا کی چھوٹی سی کربناک زندگی مگر بڑی سی تخلیقی زندگی پر گفتگو کریں گے کیونکہ میرے خیال میں مغربی ادب

کافکا کے بغیر اسی طرح نامکمل ہے جس طرح اردو ادب منٹو اور روسی ادب دوستوسکی کے بغیر نامکمل ہے''

بلند اقبال اپنے ایک مکالمے میں کہتے ہیں کہ کچھ کتابیں الہامی ہوتیں ہیں۔ اُن کی ابتدا ایمان کے عہد سے ہوتی ہے، وہ کتابیں اپنے کندھوں پر انسانی اخلاقیات کی زمہ داری کا بوجھ اٹھا کر صدیوں سے انسانوں کی روح میں شامل ہیں مگر پھر کچھ کتابیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو تاریخ انسانیت میں اخلاقیات کی ناکامی پر فلسفیانہ سوالات اٹھاتی ہیں۔

وہ محض انسانوں پر 'مذہبی اخلاقی تعلیم پر عمل نہ کرنے' کا الزام ڈال کر سہل راستہ اختیار کر کے آگے نہیں بڑھ جاتی ہیں بلکہ دی گئی مذہبی اخلاقیات پر تنقید کر کے اصل وجہ تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

یہودیت اور عیسائیت کے جد اعلی زرتشت کی اخلاقی تعلیم پر فریڈک نطشے نے اپنے ریمارک ایبل ناول'' دس اسپوک زرتشترہ'' میں ایسے ہی سخت سوالات اٹھائے اور بالآخر انسانوں کا مقدر ''ٹیکنالوجیکل دی لاسٹ مین'' کی شکل میں دیکھا نہ کہ اخلاقی طور پر ایک اعلی 'سپر مین' کی صورت میں ۔۔ دوستو، یہ ہی وہ ناول ہے جس نے بیسویں صدی کے مغربی معاشرے کی روائتی کرسچن فکر کو کسی مجرم کی طرح ایک کٹہرے میں لا کھڑا کیا۔۔ آئیں اس موضوع پر ہم مکالمہ کرتے ہیں کہ نطشے کی فکر نے کس طرح سے پچھلے تین ہزار برسوں کی دی گئی مذہبی 'اخلاقی' فکر پر سوال اٹھایا ہے''

بلند اقبال ,خلیل جبران کی کتاب ''پروفٹ (النبی)'' پر گفتگو کے بغیر مغرب میں لکھے گئے عظیم ناولوں پر مکالموں کو نامکمل تصور کرتے ہیں ۔ اُن کے مطابق اس میں ہر گز دو رائے نہیں ہے کہ خلیل جبران کا کلام بیسویں صدی کے عربی ادب میں ایک نمائندہ ترین حیثیت رکھتا ہے۔جوں جوں ہم خلیل جبران کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ بیک وقت فریڈرک نطشے کی باغیانہ فکر، ولیم بلیک کی پینتھ ازم اور اسلامی وحدت الوجود کے فلسفے کے نازک دھاگوں سے انتہائی نفاست کے ساتھ بٹا ہوا ہے۔

ہمیں یوں لگتا ہے کہ جیسے معنویت کی ایک دبیز اور گہری تہہ ہے جو پرت در پرت پیاز کی پرتوں کی طرح ایک دوسرے پر بچھی ہوئی ہے اور جو ہر بار اپنے پڑھنے والوں کو ایک نئی فکری دنیا میں پہنچا دیتی ہے اور زندگی کے نت نئے مفہوم سے آگاہ کرتی ہے۔

آج ہم خلیل جبران کے ماسٹر پیس ''دی پرافٹ (النبی)'' پر گفتگو کرتے ہیں۔ دس میلین سے زیادہ بکنے والے اس نظمیہ ناول 'النبی' کی وجہ شہرت اس کا خوبصورت انداز تکلم ، متاثر کن فلسفیانہ لہجہ اور زندگی کے بنیادی مسائل کی تفہیم و تشریحات پر خلیل جبران کی گہری فکر کا احاطہ ہے شائد اسی لیے یہ کتاب آج تک دنیا بھر کی کتابوں کی دوکانوں اور لائبریریوں میں مرکزی حیثیت میں سجی ہوئی ملتی ہے۔

بلند اقبال کے مکالمہ نگاری کی ایک طویل فہرست ہے جس میں سے یہ چیدہ چیدہ مکالموں کا تزکرہ ہے۔ بلند اقبال نے مغربی ادب پر بھی تاریخی ادوار کے لحاظ سے مکالماتی کتاب مرتب کی ہے جو آج کل اشاعت کے مراحل میں ہے بالکل اسی

طرح وہ آج کل بھی وہ 'بلند اقبال سے پانچ سوال' کے نام سے مکالمات کے ایک سلسلے میں مصروف ہیں۔اس دوران وہ ایک درجن سے زائد سیاسی، سماجی، نفسیاتی، ادبی اور فلسفیانہ موضوعات پر گفتگو کر چکے ہیں۔

خیبر پختونخواہ سے تعلق رکھنے والے ایک نوجوان ڈاکٹر محمد شہزاد ڈاکٹر بلند اقبال سے مختلف چیلنجنگ موضوعات پر پانچ بنیادی اور ایڈوانس نوعیت کے سوالات کرتے ہیں اور خصوصا پختونخواہ میں علمی گفتگو کے زریعے ایک مکالماتی فضا قائم کرنے کی کوشش میں مشغول ہیں۔

بلند اقبال کے دوسو سے زائد مکالمات، اپنے موضوعاتی سطح کے لحاظ سے غور و فکر پر آمادہ کرتے ہوئے ملتے ہیں۔اس میں شبہ نہیں ہے کہ انہوں نے گفتگو کا جو اعلی ترین علمی معیار قائم کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔بلند اقبال کے مکالمات، بحث و مباحثہ اور گفت و شنید سے ایک ایسی علمی دنیا قائم ہوگئی ہے جو اپنے تئیں ایک ادارے، تعلیم گاہ یا انسٹیچیوشن کا درجہ رکھتی ہے۔اُن کے ساتھ ان تمام پُر دلائیل مکالموں میں کئی ایک ادیب، شاعر، دانشور، ماہر نفسیات، تاریخ دان، سماجی سائنسدان، قانون داں اور فلسفی شریک رہیے ہیں جن میں سر فہرست ان کے قریبی علمی ہم سفر اور ماہر نفسیات دوست ڈاکٹر خالد سہیل نظر آتے ہیں جن کے ساتھ اُن کے لگ بھگ سو کے قریب مکالمے شامل ہیں۔

ڈاکٹر خالد سہیل کے علاوہ ان کے مکالمات کی ایک بڑی تعداد میں پروفیسر مبارک علی، پروفیسر ہود بھائی، پروفیسر مہدی حسن، پروفیسر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر ستیہ پال آنند، پروفیسر اوج کمال، رائٹر طارق فتح، کالمسٹ منیر سامی، ناول نگار مشرف عالم زوقی، ناول نگار رحمن عباس، ناول نگار نورالحسنین، بیرسٹر

حامد بھاشانی، بیرسٹر جاوید صدیقی، رائٹر نور ظہیر، رائٹر نسیم سید، ادیب امجد اسلام امجد، ناول نگار نعیم بیگ، رائٹر مبارک حیدر اور ڈاکٹر فرزانہ حسن نمایاں طور پر شامل رہے ہیں جو بلند اقبال کی علمی قابلیت اور مکالمے کی فطری صلاحیت سے متاثر نظر آتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ عبدالستار ''دانائی کا سفر'' (ڈاکٹر خالد سہیل اور ڈاکٹر بلند اقبال کے علمی مکالمے) سانجھ پبلی کیشن لاہور، ۲۰۲۱ء ص ۱۱

۲۔ ایضاً ص ۱۷

۳۔ ایضاً ص ۱۸

۴۔ ایضاً ص ۱۹

۵۔ ایضاً ص ۲۳

۶۔ ایضاً ص ۴۵

۷۔ ایضاً ص ۴۷

۸۔ ایضاً ص ۸۳

۹۔ ایضاً ص ۹۱

۱۰۔ بلند اقبال، ڈاکٹر ''سارے ہی محبت نامے میرے'' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۱۳ء ص ۱۷۰

۱۱۔ ایضاً ص ۱۷۳

۱۲۔ ایضاً ص ۷۹

۱۳۔ ایضاً ص ۶۶

باب پنجم

محاکمہ

محاکمہ

اردو ادب کے طالبعلم ہونے کے ناطے عموماً ہماری خواہش ہوتی ہے کہ ہم اپنے مقالے کا موضوع کسی ایسی ادبی شخصیت کو بنائیں جن کی ادبی حیثیت مسلمہ ہو اور جن کی ادبی خدمات میں کسی قسم کے شک و شبہے کی گنجائش نہ ہو کیونکہ ایسی صورت میں ادبی مقالہ بہت آسانی سے اساتذہ کرام کے لیے قبولیت کا درجہ حاصل کرلیتا ہے اورخود طالب علم کے لیے بھی ایسے مقالے کے لیے معلومات کا اکھٹا کرنا قدرے آسان ہوتا ہے اور پھر جواز کے خاطر کسی بحث یا چیلنج کے امکانات کا بھی کم سے کم سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اکثر و بیشتر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ وہ ادیب جو روائتی طرز کا ادب تخلیق کرتے ہیں چاہے وہ شاعری ہو یا نثر یا ڈرامہ نگاری ہو یا کالم نویسی ،اُن کی شخصیت عمومی طور پر ایک ہی ڈائمینشن پر مشتمل ہوتی ہیں کیونکہ ایک مخصوص فکری عنصر یا معاشرتی لب و لہجہ یا نفسیاتی و سماجی موضوعات کی یکسانیت باآسانی طالب علم کو اسی مخصوص طرز فکر کے اطراف رکھتی ہے اور قدرے آسانی سے اُس طرز کے موضوع پر کتابوں یا حوالوں کا حصول آسان بنا دیتی ہیں اور یوں ایسی شخصیات کو مقالے کے لیے قلم بند کردینا آسان ہو جاتا ہے۔

بالکل اسی طرح بعض روائتی موضوعات بھی ایسی شخصیات کی طرح مقالے کے موضوعات کا سبب بنتے ہیں مگر اپنی یکسانیت کے بدولت ادب میں کسی نئے ہونے والے تجربے یا ادبی دنیا کے ساتھ سوشل سائنسز کے دیگر تجربات کے ساتھ برتے گئے نئے تعلقات کے تعارف کا سبب بننے میں اکثر و بیشتر ناکام رہتے

ہیں اور یوں ڈگری کے حصول کا تو سبب بن جاتے ہیں مگر ادب میں کسی نئی جہد یا نئی تخلیق کے ذکر کا سبب نہیں بن پاتے ہیں۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو میرے لیے ڈاکٹر بلند اقبال کا تعارف ایک خوش آئند اتفاق کا سبب بنا اور پھر جوں جوں میں ان کی شخصیت کے مختلف ڈائمنشنز سے واقف ہوتا چلا گیا مجھے لگا جیسے کہ بعض شخصیات اپنی طرز تخلیق، طرز تحریر، طرز تخیل اور طرز عمل میں فطرتاً منفرد ہوتی ہیں اور ان کا شمار ایسی چیدہ چیدہ شخصیات میں ہوتا ہے جو بیک وقت ایک تخلیق کار ہونے کے ناطے نہ صرف علم ادبیات کو نئے تجربات سے ہم کنار کر رہیں ہیں بلکہ علم فلسفہ، تاریخ، مذہبیات، نفسیات، سیاست اور سماجیات حتّٰی کہ سائنسی علوم سے بھی اپنے قاری کو بہت کچھ نواز رہی ہوتیں ہیں۔

ڈاکٹر بلند اقبال کے ادبی تجربات تحریر کی صورت میں اُن کے تخلیقی ادب یعنی افسانے، ناول اور مضمون نگاری میں ایک طرف جلوہ گر ہوئے ہیں تو مکالموں کی شکل میں کئی ایک مشکل ترین موضوعات خصوصا فلسفہ اور نفسیات کے پیچیدہ علمی موضوعات پر جابجا ملتے ہیں اور پھر یہی نہیں بلکہ عملی طور پر بھی وہ بیمار انسانیت کی خدمت کرنے میں مصروف دکھائی دیتے ہیں یعنی بلند اقبال صحیح معنوں میں ایک ایسے تخلیق کار ہیں جو اظہار کے تمام تر پیراؤں کے ساتھ اپنے معاشرتی کردار کو نبھا رہے ہیں۔ کسی ادیب کا یوں مستقل مزاجی کے ساتھ بیک وقت اتنی ساری جہتوں پر کام کرنا اور پھر خود کو منوانا آسان ہیں مگر بلند اقبال کی شخصیت کا توازن اور مستقل مزاج نے اسے ممکن کر دکھایا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ میں نے ان کی ذات کے صرف ایک پہلو کو اپنا موضوع بنانے کے بجائے ان کی شخصیت کی مجموعی تخلیقی جہات کو اپنے ایم فل کے تھیسیز کا موضوع بنایا ہے تاکہ دور حاضر میں ادبی تخلیق کار کی غیر روائتی تخلیق کی کئی جہتوں کو ایک ساتھ متعارف کرایا جاسکے اور معاشرتی بدلاؤ کے لیے تخلیق کار کی عملی زمہ داریوں کے حوالے سے بھی اظہار کیا جائے جو عمومی طور پر بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں ناپید نظرآتی ہیں۔اس سلسلے میں ڈاکٹر بلند اقبال مجھے ایک انٹرویو کے دوران ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ملتے ہیں کہ :

''جب ایک پاکستانی ادیب مشہور فرانسیسی ادیب ژان پال سارتر سے ملنے ایک کیفے میں پہنچے تو باتوں ہی باتوں میں سارتر نے اس ادیب سے پاکستان میں سیاسی تبدیلیوں کے حوالے سے کوئی سوال کیا جس کے جواب میں پاکستانی ادیب نے کہا کہ میں ایک ادیب ہوں میرا سیاست سے کیا کام ہے؟اس بات کو سن کر سارتر حیران ہوگئے بلکہ مزید گفتگو کرنا مناسب نہیں سمجھے کیونکہ اُن کے لیے ایک ادیب کی تعریف میں اس کا ایک عملی طور پر سوشل ریفارمر ہونا شامل ہے جیسا کہ وہ خود تھے اور اس وجہ سے جیل بھی جاچکے تھے''۔

ڈاکٹر بلند اقبال کی تخلیقی جہات یعنی افسانہ نگاری، ناول نگاری اور مکالمہ نگاری کو سمجھنے سے قبل ان کی شخصیت کا جاننا ضروری ہے کیونکہ کسی بھی شخص کی

فکری نشو نما میں اُس کی موروثی اور خاندانی ساخت ، گرد و پیش اور ماحول، تعلیم و تربیت ، سماجی اور معاشی حالات ، علمی دلچسپیاں اور مشکل ترین حالات اور سانحوں سے نمود آزما ہونے کے جواہر ، کامیابیاں و ناکامیاں اور زندگی کے حوالے سے نظریات سے آگہی ضروری ہے۔

یہی وجہ ہے کہ میرے تھیسیز کا پہلا عنوان ڈاکٹر بلند اقبال ۔ ایک تعارف ہے جس میں میں نے اُن کی سوانح حیات پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ اس دوران میں نے ان کی شخصیت کے نشو نما میں ان عناصر کا تذکرہ کیا ہے جو نہ صرف بچپن سے ان کی مخصوص نفسیاتی ساخت بنانے کا سبب بنے ہیں بلکہ ایک نظریاتی ادیب بننے میں بھی اہم کردار ادا کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ۔ مثلا وہ اردو ادب کی قابل احترام اور مشہور شخصیت حمایت علی شاعر کے صاحبزادے ہیں اور اُنکی والدہ مرحومہ معراج نسیم بھی ایک افسانہ نگار تھی ۔

اس لحاظ سے انہیں بچپن سے ایک ادبی ماحول ملا جس کی وجہ سے ایک طرف تو انہیں اس عہد کے اہم پاکستانی ادیبو ں سے بالمشافہ ملنے کا موقع ملا تو دوسری طرف پاکستان ، انڈ یا اور مغربی دنیا کے عظیم ادیبو ں کی تحریر یں پڑھنے کا بھی موقع ملا یعنی ادب نہ صرف ان کے خون میں شامل تھا بلکہ اُس کی روانی میں بھی شامل ہوتا چلا گیا چناچہ کم عمری میں ہی انہوں نے سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، قراۃالعین حیدر، غلام عباس اور ممتاز مفتی جیسے بڑے بڑے افسانہ نگاروں کو پڑھنا شروع کر دیا تھا ۔

اور پھر جوں جوں بڑے ہوتے گئے اُن کے مطالعے میں ٹالسٹائی اور میکسم گورکی کی تحریروں کے تراجم اور فرائڈ کے نفسیاتی تجزیئے بھی شامل ہوتے چلے

گئے اور یوں لاشعوری اور شعوری طور پر ان کی شخصیت پر اثر انداز ہوتے چلے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ میڈیکل کالج کے ابتدائی سالوں میں ہی اُن کے افسانے کالج کے میگزینز میں چھپنے شروع ہو گئے۔ مگر بلند اقبال کی تعلیمی زندگی کا رومانٹک دور بہت جلد ختم ہو گیا تھا کیونکہ ایم بی بی ایس کرنے کے فوراً بعد ہی انہیں پاکستان میں ایک مشکل معاشی دور کا سامنا کرنا پڑا۔

ایک اچھے طالب علم ہونے کے باوجود، کئی برسوں کی انتھک کوشش کے بعد بھی وہ پاکستان میں کوئی معاشی مستقبل حاصل نہ کر سکے اور مجبوراً پاکستان چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ بیرون ملک آکر بلند اقبال نے اپنی زندگی کے مشکل ترین حالات کا مقابلہ جواں مردی سے کیا اس بات کا اندازہ اُن کی اپنی سوانح حیات میں درج ہے۔ وہ خود ایک جگہ رقم طراز ہیں کہ :

> ''اِس درمیان میں ظاہر ہے خاصا مشکل وقت بھی دیکھنا پڑا اور جو بھی معاشی مسائل ملے، ان سے نبرد آزما بھی ہونا پڑا جن میں نیویارک اور شکاگو کی سرد ترین راتوں میں پٹرول پمپ بھرنے سے لے کر اخبار اور بن کباب بیچنے تک کے کام بھی شامل رہے۔ مگر ان سب کاموں نے میری ذہنی بلوغت اور نشوونما میں خاصا کردار ادا کیا''۔

یہ ٹھیک ہے کہ بلند اقبال کی انتھک محنت اور مستقل مزاجی نے انہیں کامیاب تو کر دیا اور وہ مشکل ترین ماحول سے نکل گئے اور امریکہ سے میڈیسن میں پوسٹ گریجوشن اور فیلوشپ کرنے میں کامیاب بھی ہو گئے مگر شاید اُن کی

زندگی میں ابھی امتحانات بلکہ کچھ سخت سانحے ابھی باقی تھے۔ قدرت بلند اقبال سے ایک طبیب کے علاوہ بھی کچھ اہم کام لینے کا طے کر چکی تھی یہی وجہ ہے کہ جونہی ان کی پوسٹ گریجوشن اور فیملو شپ مکمل ہوئی، اُن کی زندگی کی سب سے پیاری شے یعنی اُن کی ماں اُن سے جدا ہو گئی۔

ماں کا انتقال بلند اقبال کی زندگی کا سب سے بڑا سانحہ ثابت ہوا۔ انہوں نے اپنی ماں کو بچانے کے لیے زمین اور آسمان ایک کر دیا تھا مگر شائد قدرت اُن سے اس سے زیادہ کی توقع کر رہی تھی یعنی اُسی زمین و اسمان کے راز مذہب، فلسفے اور سائنس کے ذریعے سے اُن تک پہچانے کی تگ و دو میں مصروف تھی۔

یہی وجہ ہے کہ والدہ کے انتقال کے بعد وہ وجودیت کے فلسفے میں مذہب اور سائنس کے راستے سے داخل ہو گئے اور اپنے دکھ کے ساتھ، پوری کائنات کے دکھوں کے راز جاننے کی کوشش میں جڑ گئے۔ اگلے چند برسوں میں انہوں سے سو سے زائد افسانے لکھے۔ انہوں نے اپنی والدہ کی یاد میں ایک آن لائن ہسپتال بنایا، اپنے والد حمایت علی شاعر کی کچھ اس طرح سے خدمت فرمائی کہ بقول ان کے:

''اپنے والد کی خدمت کے دوران میں یہی سمجھتا تھا کہ اگر امی زندہ ہوتی تو ان کی زندگی کی ہر چھوٹی سی چھوٹی شے کا خیال رکھتی اب جبکہ وہ نہیں ہیں تو مجھے انکی خدمت اس طرح کرنی چاہیے کہ اگر عالم بالا میں میری امی سے ملاقات ہو تو مجھے شرمندہ نہ ہونا پڑ جائے''۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو بلند اقبال کی شخصیت کی بُنت میں اُن کے والدین کے مورثی ادبی عناصر، کم عمری سے مقامی اور غیر مقامی ادب کا مطالعہ،

پاکستان میں اُن کا معاشی و معاشری مسائل کا سامنا، طب کی تعلیم کے دوران معاشرے میں صحت کے مسائل سے آگہی ، پاکستان میں اعلی تعلیم کے حصول اور روزگار کے لیے ملنے والی مشکلات ، ہجرت کے دکھ ، خاندان اور وطن سے دوری اور کلچر شاک یا دھچکہ ، بیرون ملک معاشی مسائل کا سامنا، اعلی تعلیم کا حصول اور ایک ترقی یافتہ معاشرےاور ترقی پزیر معاشرے کے درمیان طبّی اور دیگر سماجی سہولتوں کے فرق کو سمجھنے کی کوشش، دو مختلف سماج کے مجموعی فرق کا سامنا، رنگ ، نسل اور مذہب کے دونوں اطراف کے معاشروں پر اثرات کا مشاہدہ ، عوام و خواص کے سیاسی و سماجی نقطہ نظر میں فرق کا احساس ، زندگی سہنے ، گزارنے اور لطف اندوز ہونے کے معاشرتی فرق کے تجربے سے واقفیت ، والدہ کا سانحہ اور نفسیاتی، مذہبی اور فلسفیانہ تفہیم اور فکر کے مجموعی اثرات کا تخلیقی ادب میں اظہار سے گزرنا اور اپنی زندگی کے مشاہدات، تجربات اور مطالعے کو دیگر انسانوں کی ذہنی تربیت اور جسمانی علاج کے لیے وقف کرنا۔

مختصراً یہ وہ تمام تر عناصر تھے جنہوں نے مجموعی طور پر بلند اقبال کا سفر ایک جسمانی طبیب سے روحانی طبیب کی جانب کردیا اور یوں بلند اقبال کی مجموعی شخصیت ایک مفکر ، مصنف اور ایسے طبیب کی شکل اختیار کرگئی جو بیک وقت افسانہ نگار، ناول نگار، مکالمہ نگار اور بیمار انسانیت کی رضاکارانہ مدد کے خاطر آن لائن ہسپتال کے معمار کی بنتی چلی گئی۔

بلند اقبال کی سوانح حیات کے مطالعے کے بغیر ان کے تخیل کے حقیقی جواہر سے آگہی ممکن نہیں تھی اسی لیے میں نے انکی فکری نشوونما کو سمجھنے کے لیے اگلے تین ابواب میں اُن کی افسانے نگاری ، ناول نگاری اور مکالم نگاری کی تفہیم

کی کوشش کی ہے۔ بلند اقبال کی دوران تعلیم کی ابتدائی افسانہ نگاری محض اُن کے مورثی جوہر کی بنیادوں پر تخلیق ہوئی ہیں اس لیے اُس میں مورثی عنصر تو دکھائی دیتا ہے اور ادب سے واقفیت کے بدولت کرشن چندر کی طرح کا افسانوی رومانس ازم اور سعادت حسین منٹو کی طرح کی طنزیہ کاٹ تو محسوس ہوتی ہے مگر علم و ادب کی وہ بلوغت دکھائی نہیں دیتی ہے جو اگلی دہائی کے تلخ و شیریں تجربات، سانحوں، مذہب، نفسیات اور فلسفے کے مطالعے کے بعد انہیں ملتی چلی گئی۔

زمانہ طالب علمی کے دو افسانوں تمنا اور دس ہزار چغد کے لگ بھگ میں برسوں کے بعد ہمیں اُن کی پہلی سنجیدہ تحریر 'یا بی بی سیدہ' اپنی والدہ کی وفات پر ملتی ہے جس میں وہ دل گرفتہ صدیقہ کبریٰ، حضرت فاطمہ زہرہ سے دعا کرتے ہوئے ملتے ہیں کہ:

''یا بی بی سیدہ، سلام کروں گا چودہ، میری ماں کو کردے پیدا''

یہی وجہ ہے کہ اُن کے پہلے افسانے کا عنوان بھی 'فرشتے کے آنسو' تھا۔ یوں تو اس مجموعے کے زیادہ تر افسانے اُن کی ماں کی رحلت کی وجہ سے ان کے دل اور ذہن کے درمیان نفسیاتی ٹکراؤ کے نتائج میں تخلیق کیے ہوئے ملتے ہیں مگر اس دوران وہ اپنے والد اور خاندان کے دیگر افراد کے ساتھ ملکر والدہ کے لیے ایک کتاب 'ہماری امی جان' بھی مرتب کرنے میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ اس کتاب میں شامل اُن کی چند نظمیں اور مضامین اُن کے تخلیقی سفر کے ارتقا کا واضح اشارہ دیتے ہوئے ملتے ہیں۔

یہ وہی دور ہے جس میں اُن کا دل اور ذہن پچھلے میں برسوں کے معاشی، سماجی اور تہذیبی ادوار کے فرق سے واقف بھی ہوا تھا۔ یہی نہیں اس سے

قبل دوران طالب علمی بھی وہ طب کے تفصیلی اور ادب کے سرسری مطالعے کے دوران ضیا الحق کی سیاسی و سماجی گھٹن، مذہبی انتہا پسندی اور نسل پرستی کے واقعات سے بھی دوچار رہے اوران تجربات کو تعلیمی اداروں اور محلوں، گلیوں اور بازاروں کے شاہد بھی رہے اوراپنے والد کی تربیت کے دوران اس پر پروگریسو ذہن کے سخت تنقیدانہ رویوں سے بھی واقف ہوتے رہے تھے۔

والدہ کی وفات کے بعد کے برسوں میں اُن کی تخلیق میں مذہب کا براہ راست مطالعہ، فلسفے اور تاریخ سے شناسی بھی شامل ہوتی چلی گئی اور پھر مغربی ادبیات بھی اُن کی واقفیت بڑھتی چلی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ فرشتے کے آنسو کے افسانوں میں کہیں ہمیں مذہب کی صوفیانہ فکر، دور قدیم وجدید کا یونانی فلسفہ ،ہندوستان کی تہذیب، مغرب کا دور حاضر کا ادب بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ بلند اقبال کااپنی پہلی کتاب 'فرشتے کے آنسو' کا انتساب اُن کے دل کی غمازی کرتا ہے جب وہ کہتے ہیں :

''اے خدائے ذوالجلال، میں جب جب تیرے دھندلائے چہرے میں اپنی محبتوں کے رنگ بھرتا ہوں ۔۔ توامی جان مجھے آپ ہی نظر آتی ہیں''۔

وہ خود بھی اپنی پہلی کتاب کو اپنا کتھارسس ہی کہتے ہوئے ملتے ہیں جب وہ لکھتے ہیں :

''پچھلے چند برسوں سے میں کسی ایسی سچی کہانی کی تلاش میں اپنی ذات کے اندراُترا ہوا ہوں۔ میں جو اس سے قبل ایک رنگ برنگی نیم آوارہ تتلی کی طرح

بیتے اور آنے والے لمحوں سے بے نیاز، ہوا کے دوش بدوش اُڑتا پھرتا تھا کہ اچانک ہوا کے ایک تند جھونکے سے اپنے سارے خوشنما رنگ ہی لٹا بیٹھا اور اب اپنی برہنہ ہوتی تخلیقی جین کے سوتوں سے پھوٹنے والی کہانیوں کے جال سے خود کی اور اپنے اردگرد پھیلی برہنگی کو ڈھانک رہا ہوں۔ یہ کیسا ویژن ہے؟ یہ کیسا کتھارسس ہے؟''

اُس دور میں ڈاکٹر بلند اقبال کے افسانوں میں جذباتی و موضوعاتی شدت کا اندازہ مجھے اس واقعہ سے بھی ہوا جب میری نظر سے اُن کے افسانے 'لال چونے' پر بنی ہوئی ایک شارٹ ڈاکومینٹری فلم گزری جس کا علم ڈاکٹر بلند اقبال کو بھی بعد میں ہوا کیونکہ لاہور آرٹس کالج کی طالبہ ڈاکٹر بلند اقبال کے نام سے واقف نہیں تھی اور ایک گمنام کہانی کے طور پر اُس سے متاثر ہو کر اُسے اپنے اسائنمنٹ کا حصہ بنا بیٹھی اور ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی۔

افسانے 'لال چونا' کے لیے دیے گئے تعارفی کلمات سے بلند اقبال کے زمانہ طالبعلمی یا بعد کے معاشرتی تجربات کی آگاہی ہوتی ہے کہ کس طرح ایک نم دل اپنے اردگرد کے واقعات سے رنجیدہ خاطر تھا۔ ڈاکومینٹری فلم 'لال چونا' کے بارے میں تعارفی کلمات میں درج تھا کہ:

'' اور جب لفظ بت بن جائیں، معنوں سے بے نیاز ہو جائیں تو ہر الہامی کتاب بُت پرستی کا عنوان بن جاتی ہے۔۔۔ اور جب مؤزن ابو جہل بن جائے کسی

ابن جہل کی طرح محض لفظوں کا انبار بن جائے تو مذہب تعصبات کا نشان بن جاتا ہے ۔۔۔ اور جب عبادت گاہیں، قتل گاہیں بن جائیں تو محبت بھرے افسانے محض 'لال چونا' بن جاتے ہیں ۔۔۔ اور پھر گنبدوں میں گونجتے رہ جاتے ہیں ۔ چند سوال، کیا مساجد قتل گاہیں بن جائیں گی؟ انسانیت کی؟ امن کی؟ محبت کی؟ سلامتی کی؟ ۔۔ یہ کیسا رنگ چڑھا ہے مساجد کے گنبدوں پر؟''

ایک بڑا افسانہ ہر دور کی تصویر ہوتا ہے اور بقول بلند اقبال کے جو فطرتاً عاجزی سے بھرپور ہیں کہتے ہیں :

''ایک مستقل براد ور چھوٹے افسانے کو بھی بڑا افسانہ بنا دیتا ہے۔ یہ نقطہ اپنے تئیں عہد کی آگہی کے لیے اہم ہے کہ سماجی شکستگی کا اس سے بڑا بھلا کیا اور المیہ ہو سکتا ہے؟''

بلند اقبال جب اپنے افسانے 'بے زمینی نسل کشی ہے' میں ہجرت کے تجربے کو انسانی تہذیبی ارتقا سے جوڑتے ہیں اور تاریخ کے عزاب کو وقت کی گرفت میں جکڑا ہوا پاتے ہیں تو لکھتے ہیں :

''وقت تو عفریت کا روپ دھار چکا تھا، جس کی زبان شاخدار اور دانت خون آلود تھے۔ جس کا پھولا ہوا پیٹ تاریخ کے سارے راز سمیٹے، بے ہنگم انداز میں آنے والی

نسل انسانی کو پھر سے ڈکارنے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔
کتابوں کے ہر صفحے پر لفظ روتے تھے، دیو مالائی کہانیاں ہوں
یا آسمانی صحیفے، پیغمبروں کے قصے ہو یا زماں و مکاں کے
جھگڑے، ہر لفظ آنسوؤں کی شکل میں بہتا تھا''

اُن کے اسی طرح کے افسانوں سے متاثر ہو کر ڈاکٹر سنتیہ پال آنند، ڈاکٹر بلند اقبال کے افسانوں کے بارے میں یہ لکھنے کے لیے مجبور ہو گئے تھے کہ

''بلند اقبال خدا نہیں ہے۔۔۔ کردار تو خدا بھی پیدا کرتا ہے لیکن پیدا کرنے کے بعد اُنہیں بھول جاتا ہے۔ بلند اقبال اپنے کرداروں کے نکھ سکھ کچھ اس خوبصورتی سے سنوارتا ہے کہ حالات کے جھمیلوں میں پھنسے ہوئے بھی وہ خدا کی تخلیق سے کچھ زیادہ ہی جانے پہچانے لگتے ہیں۔ وہ اُن کی عادات واطوار کو پہچانتا ہے، اُن کی خوشیوں وغموں میں برابر کا شریک ہوتا ہے، اُنہیں دلاسا دیتا ہے، اُن کے غموں پر خود کراہتا ہے اور یوں اپنی کہانی مکمل کر کے جیسے خدا سے کہتا ہے 'اب تم بتاو، تم بڑے تخلیق کار تھے یا میں''

یہاں ایک بار پھر ڈاکٹر بلند اقبال کی عاجزانہ طبعیت آڑے آجاتی ہے اور وہ اپنے ایک انٹرویو کے دوران دونوں ہاتھ جوڑ کر سنتیہ پال آنند کا ذکر کرتے ہوئے ملتے ہیں اور کہتے ہیں ' بڑے لوگ اپنے سے چھوٹوں کا دل اسی طرح سے بڑا کرتے ہیں تاکہ اُن کی ہمت افزائی ہو اور وہ تخلیقی عمل سے جڑے رہیں اور

دوسری طرف بہت شائستگی سے لفظ 'خدا' کی تفہیم بھی کرتے ہوئے ملتے ہیں کہ آنند صاحب کے لیے خدا ایک اعلیٰ ترین تخلیقی استعارہ ہے اور وہ نئے تخلیق کاروں کو اُس منزل کی طرف بڑھنے کا درس دیتے ہوئے ملتے ہیں۔

یہاں آنند صاحب کا خدا مذہب کا روائتی خدا نہیں بلکہ تخلیات کا اصل محور ہے جس کے تجربے میں زمینی دکھ انسانوں کے ساتھ شامل ہو کر بھی شامل نہیں ہو سکے کیونکہ وہ خدا ہے انسان نہیں اور زمینی حقائق بہر حال آسمانی حقائق سے مختلف تو ہیں۔ یوں وہ مذہبی روائتی ذہنوں کو بھی بے جا تنقید سے باز رکھنے کے خاطر علم و ادب کو مذہبی انتہا پسندانہ فکر سے علحیدہ رکھنے کی ترغیب دیتے ہوئے ملتے ہیں کہ مذہب اور ادب کا ملاپ ملا کی روائتی سوچ سے قطعی پرے ہی ممکن ہے۔

ڈاکٹر بلند اقبال کے افسانوی سفر کو سمجھنے میں مجھے جس ادیب کی رائے نے سب سے زیادہ مدد کی وہ مرحوم مشرف عالم زوقی بھی تھے کیونکہ اُن کی رائے کے پس منظر سے ڈاکٹر بلند اقبال کی کئی ایک کہانیوں کے پیچیدہ موضوعات میرے لیے کھلتے چلے گئے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ بلند اقبال کا مطالعہ بہت وسیع ہے اور شاید وہ آئین اسٹائین کے اس کہے پر پورے اترتے ہیں کہ جب ہم کسی موضوع کو پڑھانے کے لائق ہوتے ہیں تب ہی ہم اُس موضوع پر اپنے علم کا دعوی کرنے کے لائق ہو پاتے ہیں۔

بلند اقبال نے اس بات کو چند قدم آگے بڑھ کر یوں ثابت کیا کہ اُن کا سماجی علوم خصوصا فلسفے، ادب اور نفسیات کا مطالعہ اس قدر گہرائی اور گیرائی کے ساتھ ہے کہانیوں نے اپنے موضوعات کو نا صرف مکالموں کے سپرد کیا بلکہ اُن موضوعات کو کہانیوں کے کردار، ڈائیلاگ، موضوعات اور مناظر تک میں شامل

کر دیا۔ مشرف ذوقی صاحب ڈاکٹر بلند اقبال کی کتاب ' میری اکیاون کہانیاں' کے مطالعے کے بعد لکھتے ہیں :

''بلند کے افسانوں کو سمجھنا آسان نہیں ہے۔ بلند ایک منجھا ہوا فوٹو گرافر ہے لیکن وہ اپنی کہانیوں میں چھوٹی چھوٹی جزیات کے ساتھ فوٹو گرافی کا عمل دہراتا ہے، وہیں وہ یہ بات بھی جانتا ہے کہ ۔۔۔ 'کچھ اور چاہیے وسعت میرے بیان کے لیے ۔۔۔' وہ جانتا ہے کہ افسانے کے رمز نئی ڈسکوری میں پوشیدہ ہیں۔ آپ کے پاس حیات و ممات سے وابستہ نئے فلسفے نہیں ہونگے تو آپ کی کہانیاں ہزاروں لاکھوں ٹن کاغذ کے درمیان کہیں گم ہو جائیں گی۔ وہ اپنا فلسفہ تراشتا ہے۔ زندگی کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے ۔۔۔۔اشتراکیت اور جدیدیت سے الگ اپنی راہ بناتا ہے اور کسی حد تک یہ کہا جا سکتا ہے کہ بلند کے پاس اگر کوئی ازم یا راستہ ہے تو وہ انسانی زاویہ ہے۔ وہ اپنی ہر کہانی میں اسی انسانی زاویے کو برتنے کی کوشش کرتا ہے۔ سنہ ۲۰۱۲ء کے آتے آتے یہ دنیا ایک ایسے ایکسپل وژن پوائنٹ تک پہنچ چکی ہے جب تیسری جنگ عظیم کا خطرہ سر اٹھانے لگا ہے۔ تہذیبوں کا تصادم جاری ہے۔ ایک طرف سائنس کی ریس ہے اور

دوسری طرف دہشت پسندی ۔ اس ریس میں انسان کہیں گم ہوگیا ہے۔ بلند، اپنی بلند بانگ کہانیوں میں صدی کے نوحہ اور تعبیر و تصریح سے گزرتے ہوئے اس انسان کو تلاش کر لیتے ہیں جو کبھی میکسم گورکی کی کہانیوں میں نظر آیا کرتا تھا۔ تیز بارش ، ڈھول پیٹتے ہنگامہ کرتے ہوئے مزدور۔ اور ایک مزدور عورت کے یہاں اس قدرتی آفات کے درمیان بچہ ہونے والا ہے اور پھر بچے کی چیخ ابھرتی ہے اور مزدور ناچنے گانے میں مصروف ہوجاتے ہیں ۔ تیز آندھی اور بارش کے درمیان بچے کی ولادت نئے انسان کی علامت بن جاتی ہے اور یہ نیا انسان بلند اقبال کی اکثر و بیشتر کہانیوں میں جب اپنی مضبوطی کے ساتھ دکھائی دیتا ہے تو بلند کو سلیوٹ کرنے کا دل چاہتا ہے۔ وہ ہمیشہ کی طرح زندگی کا نیا فلسفہ سامنے رکھتا ہے اور حیران کرجاتا ہے"

ڈاکٹر بلند اقبال کے افسانوں میں بیک وقت قدیم و جدید عہد کی تکرار ملتی ہے مگر یہ تکرار محض لفظوں کی گردان نہیں بلکہ یہ تاریخ ادوار انسانی المیوں اور سانحوں کی روشنی میں اُس کی نفسیاتی اور فلسفیانہ تفہیم سے عبارت ہے ۔ لفظوں کے استعمال اور معنویت کا لحاظ اس قدر باریک و بینی اور شائستگی کے ساتھ تعمیر ہوتا ہے کہ ایک مشتاق ادیب کا مسلسل احساس رہتا ہے۔ وہ اپنے افسانوں کو

کسی ماہر ارکیٹیکٹ کی طرح پوری پیمائش کے ساتھ صفحے پر اتارتے ہیں مگر اُس میں ان کے جذبات پوری ایمانداری اور محبت کے ساتھ شامل ہوتے ہیں جس کا احساس لفظوں کی شدت سے فوراً مل جاتا ہے کیونکہ اُن میں چھپے ہوئے جذبات بہت جلد لفظوں کا دامن چھوڑ کر قاری کے ذہن و دل کا حصہ بن جاتے ہیں۔

بلند اقبال پہلی سطر سے ہی اپنے قاری کے ارد گرد ایک آرہ بُن دیتے ہیں جسے ٹرانس کہا جاسکتا ہے یہ ٹرانس اُس حلقے کی طرح ہوتا ہے جو اپنے قاری کو بیک وقت تخلیق کا پہلا اور تیسرا آدمی بنادیتا ہے یعنی وہ کہانی کہانی کا کردار بھی بن جاتا ہے اور تخلیق کار کا حصہ بھی۔ یہ کیفیت بہت کم ہمیں عمومی افسانے نگاروں میں ملتی ہے مگر بلند اقبال کے کئی افسانوں میں مجموعی طور پر یہ کیفیت موجود ہے۔ بلند اقبال کے افسانوں میں اُن کے نظریاتی ہونے کا احساس ملتا ہے جو اپنی جگہ ایک مثبت اور منفی دونوں طرح کا عمل ہے مگر یہ نقطہ متنازعہ ہے۔کیونکہ کچھ تنقید نگار اس کو افسانے کی کمزوری سمجھتے ہیں۔

مگر ایک طالب علم ہونے کے ناطے میرا خیال ہے کہ نظریہ انسان سے الگ کوئی حیثیت نہیں رکھتا اورانسان بھی بغیر نظریے کے جانور سے مختلف حیوان نہیں ہے اس لیے نظریہ انسانی حیات کا ایک لازمی جز ہے۔ یہ نقطہ ضرور اہم ہے کہ تخلیق کار اگر اپنے نظریات کو بھونڈے طریقے سے اپنے تخلیقی عمل کا حصہ بنائے تو تخلیق کا حسن متاثر ہوتا ہے بلکہ اکثر و بیشتر نظریات کے پرچار سے تخلیق ،کسی ناصح کی نصیحت بن جاتی ہے ایسی صورت میں تخلیق ادب کا بنیادی مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ ادب کی زمہ داری اندھا یقین کے بجائے فکری بلوغت پیدا کرنا ہے۔

اگر ادب شعوری سطح میں اضافہ نہ کرے اور تجزیاتی و تنقیدی ذہن نہ پیدا کر سکے تو وہ ادب نہیں ہے۔ ڈاکٹر بلند اقبال کے افسانوں میں نظریات ملتے ہیں مگر اُن کا پرچار نہیں ملتا ہے اس لحاظ سے بلند اقبال کے افسانے خوبصورت تعمیری ادب کا حصہ ہیں۔

کہنے کو ڈاکٹر بلند اقبال کے ناول 'ٹوٹی ہوئی دیوار' اور 'کھوئے ہوئے صفحات' کے موضوعات مختلف ہیں۔ اُن کی تاریخی و جغرافیائی شکل بھی ایک دوسرے سے قطعی علیحدہ ہے۔ اُن کے ناولوں کے کردار، اُن کی سماجی و نفسیاتی صورت حال اور ان کے سیاسی مسائل بھی مختلف دنیاوں سے تعلق رکھتے ہیں مگر ان کا بنیادی ترین موضوع انسانی تہذیب کا اہم ترین تنازعہ ہی ہے یعنی رنگ، نسل اور مذہب جس نے انسانوں کو ایک دوسرے سے مستقل طور پر بانٹا ہوا ہے۔

زمانہ طالب علمی اور بعد کے ادوار میں ڈاکٹر بلند اقبال جن سماجی مسائل سے دوچار ہوئے اُن میں پاکستانی معاشرے میں پھیلی ہوئی مذہبی و نسلی انتہا پسندانہ رویے بھی شامل رہے جس کو بلند اقبال نے سنجیدگی سے اپنے مشاہدے و مطالعے کا حصہ بنایا۔ اُن کے دونوں ناولوں کے مطالعے سے اُن کا عالمی سیاسی تاریخ پر گہری نظر اور اُس سے متعلق واقعات سے اُن کے اپنے جغرافیائی خطے پر جملہ اثرات کی سمجھ کا اندازہ ہوتا ہے۔

اگر 'ٹوٹی ہوئی دیوار' میں وہ پچھلی تین دہایوں کے افغانستان اور پاکستان کے سیاسی و سماجی مسائل پر ایک فکر انگیز نظر ڈالتے ہوئے ملتے ہیں تو 'کھوئے ہوئے صفحات' میں وہ پچھلے سو برسوں کی مغربی دنیا خصوصا نازیوں کے پیدا کئے ہوئے سماجی و سیاسی مسائل اور بنگلہ دیش کی پچھلے پچاس برسوں کی دنیا

میں مغربی پاکستان کے کردار یا پچھلے پچھتر برسوں کے کشمیر میں ہندوستان و پاکستان کی فوجی کشمکش کا تجزیہ کرتے ہوئے ملتے ہیں۔ مشرق و مغرب کے تہذیبی تناظر میں لکھے گئے یہ دونوں ناول بلند اقبال کی اُس نفسیاتی الجھن کی بھی نمائندگی کرتے ہیں جو ہجرت کے نتیجے میں اُن کا نصیب بنی۔

بلند اقبال جو بیک وقت مشرق و مغرب میں تقسیم شدہ انسان ہیں جن کا آدھا دل پاکستان میں ہے جہاں انہوں نے اپنی زندگی کا سب سے خوبصورت وقت یعنی بچپن اور ابتدائی جوانی کا ایام گزارے تو اُن کا آدھا دل کینڈا اور امریکہ یا مغربی دنیا میں ہے جہاں اُنھیں اعلیٰ تعلیم ملی، روزگار کے مسائل حل ہوئے اور جہاں انہوں نے ایک پر سکون زندگی گزاری اور جو اُن کے بچوں کا ویسا ہی ملک ہے جیسے کہ اُن کے لیے پاکستان ہے۔ ان دونوں علاقوں کا صرف جغرافیہ ہی نہیں تاریخ، تہذیب، سیاست، سماج اور روائتیں بھی ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہیں۔

بلند اقبال نے ان دونوں ناولوں میں ان دونوں تہذیبوں کے فرق میں ایک مشترک نقطہ کی تلاش کی اور تنازعہ کی اُس بنیادی وجہ کو دریافت کر لیا جو ان دونوں تہذیبوں کے درمیان اور علحیدہ بھی مسائل کی بنیاد میں چھپی بیٹھی ہے۔ اس تمام تر کٹھن علمی سفر کے دوران بلند اقبال اس پل صراط پر ڈگمگائے نہیں یعنی روائتی ادیبوں کی طرح جانبداری کا شکار نہیں ہوئے۔ یعنی یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ سمندر میں تیراکی کے لیے اتر تو گئے مگر اپنا سر سطح سمندر سے باہر رکھا اور خود کو کسی ایک جانب سے بھی ڈوبنے سے بچا لیا۔

ڈاکٹر بلند اقبال کا یہ سفر کیوں کامیاب رہا؟ میرے خیال میں اُس کی وجہ ایک بار پھر اُن کا مطالعہ ہے۔ وہ خود ایک جگہ کسی انٹرویو کے دوران فرماتے ہیں :

''بدقسمتی سے انسانی تہذیب کا سفر ہر دور میں اور بالآخر رنگ، نسل اور مذہب کی تقسیم کا شکار ہوا اور اُس کی بنیادی وجہ ان تینوں اجزا کی وجہ سے علم و فکر کی تقسیم تھی جس کی وجہ سطحی سیاسی سوچ تھی جس نے بعدالزاں سوسائٹی کو مختلف عنوان کے سپرد کر دیا۔ اگر یونانی علوم کو مغربی فکر کے بجائے انسانی فکر سمجھ کر مڈل ادوار میں اسلامی یا مڈل ایسٹرن اور ایشیائی ممالک بھی اختیار کر لیتے تو یونانی فلسفیانہ فکر سے تولید ہونے والی سائنسی فکر سے دونوں اطراف کی دنیا کے درمیان فاصلے صدیوں پہلے ہی ختم ہو چکے ہوتے اور متحدہ انسانی فکر کا خواب ہزاروں برس پہلے ہی مکمل ہو جاتا اور ہم تاریخ کے کسی بہتر دہانے پر خود کو پاتے اور آج بھی قبائلی دور کی طرح رنگ، نسل اور مذہب کی بنیادوں پر تقسیم انسانوں کی عقلوں پر ماتم نہیں کر رہے ہوتے۔ کیا پتہ اس سے بہتر موضوعات آج ہمارے تخلیقی ادب کا حصہ ہوتے''۔

'ٹوٹی ہوئی دیوار' میں ڈاکٹر بلند اقبال نے صرف پاکستان، افغانستان اور کینیڈا میں پائے جانے والے رنگ، نسل اور مذاہب کے موضوع ہی کو سیاسی انداز یا واقعات سے موضوع نہیں بنایا ہے بلکہ مذہب کے آفاقی تصور اور خدا کی فلسفیانہ ساخت کو بھی بہت عالمانہ انداز میں بحث کا حصہ بنایا ہے۔ ناول کئی مقامات پر سطحی طرز کے مذہبی قاری کے لیے فکر کے کئی دروازے کھول دیتا ہے اس لحاظ سے یہ ناول اپنے قاری سے مذہبی نظریات کو طاق میں رکھ کر تاریخ، ادب اور فلسفے کے طالب علم ہونے کا تقاضہ کرتا ہے۔

اس ناول میں جرات کے ساتھ پاکستان میں چلنے والی نسلی اور مذہبی انتہا پسندی کا ذکر کیا گیا ہے جسے لکھتے ہوئے ڈاکٹر بلند اقبال پاکستان کی عمومی مذہبی سطح کا زیادہ تحمینہ لگا بیٹھے ہیں۔

پاکستان میں بدقسمتی سے ادب کے طالبعلم بھی پہلے 'مدرسہ کے طالب علم' ہیں اور بعد میں ادب یا سائنس کے طالب علم جس کی وجہ سے اُن کی ذہنی گنجائش کسی بھی فکری موضوع کے انجزاب کے لیے کم سے کم ہو چکی ہے۔ پاکستان میں مذہب کے سیاسی استعمال نے اُس کے معتدل رویوں کو سخت نقصان پہنچایا ہے جس کی وجہ سے وہ علمی وسعت، فکری تحمل اور شعوری کشادہ دلی جو ہمارے بزرگوں کا حصہ تھی وہ ہماری نوجواں نسل کو میسر نہیں ہو پائی اس تنگ نظری کی وجہ سے انتہا اور شدت پسندانہ رویوں سے نہ صرف صحت مندانہ انسانی نفسیات بیمار ہوئی بلکہ خود مذہب اسلام کے اُس خوبصورت کائناتی تصور حیات کو بھی سخت نقصان پہنچا جو محبت، امن سکون اور انسانی بھائی چارگی کا علمبردار ہے۔

اس ناول کے مطالعے کے دوران مجھے اندازہ ہوا کہ صفحات کی تعداد کے لحاظ سے یہ چھوٹا سا ناول مذہبی سیاسی تاریخ کے پس منظر سے مذہب اور سیاست کے 'ملاپ' سے پیدا ہونے والی جنگوں سے پھیلنے والی چنگیزی کے تصور پر تنقید کرتا ہوا ایک بڑا خیال سموئے ہوئے ہے، یعنی یہ 'چنگریزی' خود اسلامی ملکوں کو بھی تباہ و برباد کر سکتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ نقطہ قابل تجزیہ ہے مگر یہی اچھے ناول کی خوبی ہوتی ہے جو تنقید برائے تنقید یا تقلید برائے تقلید کی جگہ فکری سوال پیدا کرے۔

ڈاکٹر بلند اقبال کے ناول 'ٹوٹی ہوئی دیوار' نے مخصوص فکری دنیا خصوصاً پروگریسو فکر کے لوگوں کو بہت متاثر کیا مگر پاکستان کی اُس نوجوان نسل کے لیے بھی کشش کا سبب بنا جو اسی کی دہائی کے بعد پیدا ہوئی اور ملک میں پھیلی ہوئی مذہبی منافرت، انتہا پسندی، نسل پرستی اور دہشت گردی کو سیاق و سبق کے بغیر سمجھنے سے قاصر تھی۔ اس ناول کے مطالعے سے پاکستان کی موجودہ سماجی شکل کا اندازہ اچھی طرح ہو جاتا ہے۔ 'ٹوٹی ہوئی دیوار' پر ایک سیاسی یا نظریاتی ناول ہونے کا الزام لگایا جا سکتا ہے کیونکہ اس ناول کا مرکزی کردار ایک سیکولر ذہن کا انسان ہے جو مذہبی فکر کو اپنی زندگی کی تباہی کا ذمہ دار بھی سمجھتا ہے۔

ظاہر ہے جانبدارانہ فکر کسی بھی تخلیق کی کمزوری سمجھی جاتی ہے مگر ڈاکٹر بلند اقبال نے اپنے تئیں کوشش کی ہے کہ ناول کے پس منظر میں دونوں اطراف کے پہلوؤں کو اپنی کہانی کا حصہ بنائیں اور ایک توازن قائم کرنے کی کوشش کریں۔ مجھے اُن کے لیے یہ ایک مشکل مرحلہ محسوس ہوا کیونکہ اُن کے ناول کا منفی کردار ایک شدت پسند شخص ہے جو مذہبی ایمان کے بدولت سوسائٹی میں مسائل

پیدا کر رہا ہے مگر ڈاکٹر بلند اقبال نے اُس شخص کو خالص مذہبی کردار بنانے کے بجائے 'سیاسی مذہبی مینی پولیٹر' کے روپ میں بنایا ہے یعنی اُن کا تنقیدانہ رویہ مذہب کی سیاسی تفہیم ہے مگر کچھ مقامات پر وہ مذہب کی آئیڈیالوجی میں اُن لوپز کو بھی تلاش کرتے ہوئے ملتے ہیں جو سیاست کو اُن خالی جگہوں میں بھرنے میں مدد کرتے ہیں۔

اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ ایک متنازعہ موضوع پر لکھا ہوا ناول ہے جو مغربی معاشرے میں آسانی سے اور مذہبی معاشروں میں مشکل سے نگلا جاسکتا ہے مگر یہاں ڈاکٹر بلند اقبال کا سوال اس شعوری فکری فرق والے معاشرتی رویوں پر بھی ہے کیونکہ اُن کے لیے انسانی فکر یا رویوں کا فرق اُس کے رنگ نسل اور مذہب کے فرق پر کھڑی عمارت کی وجہ سے ہے۔

ڈاکٹر بلند اقبال کا دوسرا ناول 'کھوئے ہوئے صفحات' ایک بار پھر ہمیں اُن کے سیاسی وسماجی نظریات کی طرف متوجہ کرتا ہے مگر اس ناول میں وہ مذہب کی بنیادی فکر پر بحث کرنے کے بجائے ایک نئے المیے کو موضوع بناتے ہوئے رنگ، نسل اور مذہب کے فرق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ملتے ہیں۔ یہ ناول ٹیکنیکل اعتبار سے ایک مشکل موضوع محسوس ہوا کیونکہ ایک تو اس ناول کا احاطہ ٹوٹی ہوئی دیوار سے زیادہ وسیع تھا اور دوسرا اس ناول کی سیاسی شکل مختلف مقامات پر مختلف تھیں جنہیں انہوں نے کمال فن سے یکجا کیا۔

اس لحاظ سے بلند اقبال نے ایک بہت ہی منجھے ہوئے کہانی کار ہونے کا ثبوت دیا۔ اس کہانی کا موضوع یوں تو یہ ہی ہے کہ دنیا میں آئیڈیالوجز اور سیاسی مقاصد کے خاطر ہونے والی بڑی یا چھوٹی جنگوں میں وہ عام انسان لقمہ اجل بنتے

ہیں جو اُس آئیڈیالوجی یا سیاست کا کوئی حصہ نہیں ہوتے ہیں اور اُس کی وجہ ایک بار پھر اُن کا مختلف مذہب یا نسل میں پیدا ہونا ہوتا ہے اور ظاہر ہے جس کی زمہ داری اُن کی نہیں ہوتی ہے۔

ڈاکٹر بلند اقبال مغربی دنیا کے تجربات سے براہ راست گزر رہے ہیں اور ایک خوش آئند امید رکھتے ہیں کہ شاید ایک دور ایسا بھی آئے گا جب ایک نئی دنیا قائم ہوگی اور یہ رنگ، نسل او مذہب کے سیاسی فرق ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں گے۔

ڈاکٹر بلند اقبال کے ناولوں کے موضوعات اُن کے افسانوں کے موضوعات کی طرح منفرد ہیں۔ اُن کے ناول پڑھتے ہوئے یہ خیال آتا ہے جیسے یہ ایک ایک ایسے شخص کی تحریر ہے جو زمین کے مسائل سے جڑا ہوا ہے۔ اُن کا مطمع نظر یہی ہے کہ زمینی مسائل چاہے وہ سیاسی ہو یا سماجی، معاشی ہو یا معاشرتی انہیں مفکرانہ انداز میں سمجھنے کی کوشش کی جائے، اُن پر دلائل دیے جائیں اور اُنہیں انسانوں کی طرح حل کرنے کی کوشش کی جائے۔

بلند اقبال نہ تو الہامی انداز میں بات کرتے ہیں اور نہ ہی کسی من وسلویٰ کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ سادہ زبان استعمال کرتے ہیں چاہے وہ فلسفے اور نفسیات کے لیے ہو یا چاہے وہ سائنس اور آرٹ کے لیے ہو۔ ان کے ناول میں کردار وہی بات کرتے ہیں جیسا کہ عمومی انسانوں سے توقع کی جاتی ہے۔

ناول 'کھوئے ہوئے صفحات' میں ٹوٹی ہوئی دیوار' کے مقابلے میں نظریات کا بوجھ کم محسوس ہوتا ہے اس لحاظ سے 'کھوئے ہوئے صفحات' ٹوٹی ہوئی

دیوار کی طرح سیاسی ضرور ہے مگر اس میں کسی بھی مخصوص آئیڈیالوجی بشمول مذہب وغیرہ پر فلسفیانہ بحث سے اجتناب برتا گیا ہے۔

ڈاکٹر بلند اقبال کے دونوں ناول انگریزی میں ترجمہ کے بعد کم و بیش دنیا کے ہر ایک ملک میں آن لائن دکانوں پر بھی دستیاب ہیں۔ اُن کے ناول 'ٹوٹی ہوئی دیوار' کا سندھی زبان اور 'کھوئے ہوئے صفحات' کا بنگالی زبان میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے اور آج کل ہندوستان اور پاکستان میں اشاعت کے دور میں ہے۔

مکالمہ نگاری، ڈاکٹر بلند اقبال کی شخصیت کا یک اہم پہلو ہے جس کے سوتے ہمیں ایک بار پھر اُن کی شخصیت میں اُن کی مورثی ساخت سے بہتے ہوئے ملتے ہیں جس کی انہوں نے باضابطہ تربیت کی اور اپنے مستقل مطالعے سے اُس میں ایک نکھار پیدا کیا۔ اس میں کوئی دورائے نہیں کہ اُن کے والد ایک خوش آواز شاعر بھی تھے جن کا ترنم ساری اردو دنیا میں مشہور تھا اور یہی نہیں وہ پاکستان ٹیلی ویژن سے مختلف علمی پروگرامز سے بھی منسوب رہے بلکہ وہ اکثر سیمنارز میں علمی گفتگو کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ اُن کی شخصیت کا سحر اور حسن گویائی ڈاکٹر بلند اقبال کو ورثے میں نصیب ہوئی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ ٹی وی کیمرے اور اسٹیج پر مائیک کے سامنے بہت ہی بے تکلفانہ اور مہذبانہ انداز میں گفتگو کرتے ہوئے ملتے ہیں۔

بلند اقبال نے مستقل مطالعے سے اپنی گفتگو کو سامع کے لائق بنایا ہے یہی وجہ ہے کہ مختلف ادیبوں سے اُن کے مکالمے بعد ازاں کتابی اشکال میں پبلش ہوئے۔ اُنکی کتاب 'دانائی کا سفر' جس میں انہوں نے ماہر نفسیات ڈاکٹر خالد سہیل کے ساتھ فلسفے، ادب، نفسیات اور سیاست کے پس منظر میں یونانی دور

قدیم سے دور مغربی و مشرقی جدید ادوار تک گفتگو کی ہے، ٹیکسٹ بک کی شکل میں پاکستان و ہندوستان کی ماسٹرز کی کتابوں میں شامل ہونے کے لائق ہے۔

اس ایک کتاب کے مطالعے سے نہ صرف عمومی علمی تاریخ کا ارتقا بلکہ ادبیات، سماجیات اور نفسیات کی آئیڈیالجیز کے ارتقاء سے بھی آگہی ہو جاتی ہے۔

'تاریخ کے چھاؤں میں' اور 'انداز بیاں' میں ڈاکٹر بلند اقبال، ڈاکٹر مبارک علی کے ساتھ مختلف تاریخی موضوعات پر گفتگو کرتے ہوئے ملتے ہیں۔ ان کتابوں کی بنیادی اہمیت موضوعات اور مواد ہی کی نہیں بلکہ گفتگو کی شائستگی اور آداب کی بھی ہے۔ ان کتابوں کو پڑھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ مکالمہ نگاری کسی بھی مہذب معاشرے کی تعمیر و ترقی کے لیے کیوں اہم ہے۔

ڈاکٹر بلند اقبال نے اپنے مطالعے کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے نہ صرف اُن موضوعات پر تخلیقی ادب کا سلسلہ دراز کیا بلکہ وہ موضوعات جو افسانے یا ناول کا حصہ نہیں بن سکتے تھے، انہیں اپنے مکالمات کا حصہ بنا دیا اور کیونکہ وہ موضوعات اس قدر علمی نوعیت کے تھے اس لیے انہیں کتابی شکل دے دی گئی۔

یہ قدم ان کی کامیاب مکالمہ گوئی اور مکالمہ نگاری کا ثبوت ہے۔ یہی نہیں بلکہ ڈاکٹر بلند اقبال کے مکالموں کو سننے والی نسل بھی اُن کے کام کو سنجیدگی سے لیتی ہوئی پائی گئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ پچھلی دہائی سے اُن کے فلسفے پر ہونے والی ڈسکشنز اور لیکچرز کو سننے والی نسل آج یونیورسٹی کی سطح پر فلسفے کو سندھی اور پشتون سماج میں انسٹیٹیوٹولائز کرنے میں مشغول ہے۔

اُن کے طالب علم اظہر علی جو گیارہویں جماعت سے اُن کے لیکچر سن رہے تھے آج فلسفہ ڈیپارٹمنٹ میں فائنل ایئر کے طالب علم ہیں۔ انہوں نے

سندھی سماج میں اسے پروموٹ کرنے کے لیے سندھی فلاسفیکل سوسائٹی بنائی ہے۔ جس کا کام فلسفے پر لیکچر پروگرام کرنا، تعلیمی تربیتی ورکشاپس کروانا اور فلسفے کو بطور سبجیکٹ اسکول لیول پر متعارف کرنا شامل ہے۔ اُن کی کوششوں سے گورنمنٹ آف سندھ نے انٹرمیڈیٹ کالج کی سطح پر فلسفے کے لیکچررز اپوائنٹ کروانے پر راضی کرلیا ہے اور سندھ پبلک سروس کمیشن کے ذریعے بارہ سیٹس بھی مخصوص کروالی ہیں۔

ڈاکٹر بلند اقبال کی مثبت شخصیت، اُن کے مضبوط ارادے، اُن کی زندگی کی طویل جد وجہد، اور مستقل مزاجی طالب علموں کے لیے تحریک کا سبب ہے۔ وہ زندگی کے حقیقی مسائل کے حل کے حصول کے لیے فکری و عملی طور پر جڑے ہوئے ہیں اور اس کرہ عرض پر اپنی موجودگی کو معنی دینے میں مصروف ہیں۔

ڈاکٹر بلند اقبال کا شمار اُن ادیبوں میں ہوتا ہے جو تخیل، تخلیق اور عمل پر یقین رکھتے ہیں۔ اُن کی شخصیت کے تناظر میں اُن کی تخلیقات، اُنکے مکالمات، لیکچرز اور فری آن لائن ہسپتال کو دیکھ کر ساحر لدھیانوی کا ایک شعر بے ساختہ یاد آجاتا ہے جو شاید انہوں نے بلند اقبال صاحب کے لیے ہی لکھا تھا:

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر بلند اقبال بذ ریعہ سوشل میڈ یا ٹیلیفو نک رابطہ ۲۶ اپریل ۲۰۲۳ء

۲۔ بلند اقبال ، ڈاکٹر '' سارے ہی محبت نامے میرے'' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ، دہلی ۲۰۱۳ء

۳۔ بلند اقبال ، ڈاکٹر ''فرشتے کے آنسو'' دنیائے ادب ، کراچی ۲۰۰۷ء

۴۔ بلند اقبال ، ڈاکٹر ''میری اکیاون کہانیاں'' عرشیہ پبلی کیشنز نئی دہلی ۲۰۱۲ء

۵۔ ڈاکٹر بلند اقبال بطور ٹی وی اینکر پروگرام ''پاسپورڈ'' کینیڈا

۶۔ بلند اقبال، ڈاکٹر ''ٹوٹی ہوئی دیوار'' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی ۲۰۱۶ء

۷۔ بلند اقبال ، ڈاکٹر ''کھوئے ہوئے صفحات'' سانجھ پبلی کیشن لاہور ، ۲۰۲۱ء

۸۔ عبدالستار ''دانائی کا سفر''علمی مکالمے سانجھ پبلی کیشن لاہور ، ۲۰۲۱ء

کتابیات

کتابیات

ڈاکٹر بلند اقبال کی تصانیف زمائی اعتبار سے

۱۔ بلند اقبال، ڈاکٹر ''فرشتے کے آنسو'' دنیائے ادب کراچی ۲۰۰۳ء

۲۔ بلند اقبال ، ڈاکٹر '' میری اکیاون کہانیاں'' عرشیہ پبلی کیشنز ، نیو دہلی ۲۰۱۲ء

۳۔ بلند اقبال ، ڈاکٹر ''سارے ہی محبت نامے میرے'' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی ، ۲۰۱۳ء۔

۴۔ بلند اقبال ، ڈاکٹر ''ٹوٹی ہوئی دیوار'' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی، ۲۰۱۶ء

۵۔ بلند اقبال، ڈاکٹر ''کھوئے ہوئے صفحات'' سانجھ پبلی کیشن لاہور، ۲۰۲۱ء

۶۔ ''دانائی کا سفر'' (ڈاکٹر بلند اقبال اور ڈاکٹر خالد سہیل کے علمی مکالمے) ترتیب وتدوین عبدالستار، سانجھ پبلی کیشن لاہور، ۲۰۲۱ء

۷۔ ڈاکٹر بلند اقبال : ٹی وی پروگرام اینکر ''پاس ورڈ'' کینیڈا

۸۔ ڈاکٹر بلند اقبال ''ان سرچ آف وزڈم'' کینیڈا ون ٹی وی پروگرام ۲۰۱۸ء

۹۔ ''میری کہانی'' گوشۂ ڈاکٹر بلند اقبال کتابی سلسلہ۔ تحریک ادب، وارنسی اتر پردیش، انڈیا ۲۰۰۹ء

ضمیمہ جات

ضمیمہ جات

بلند اقبال خدا نہیں ہے ۔۔۔ کردار تو خدا بھی پیدا کرتا ہے لیکن پیدا کرنے کے بعد اُنہیں بھول جاتا ہے۔ بلند اقبال اپنے کرداروں کے نکھ سکھ کچھ اس خوبصورتی سے سنوارتا ہے کہ حالات کے جھمیلوں میں پھنسے ہوئے بھی وہ خدا کی تخلیق سے کچھ زیادہ ہی جانے پہچانے لگتے ہیں ۔ وہ اُن کی عادات واطوار کو پہچانتا ہے ، اُن کی خوشیوں وغموں میں برابر کا شریک ہوتا ہے ، اُنہیں دلاسا دیتا ہے ، اُن کے غموں پر خود کراہتا ہے اور یوں اپنی کہانی مکمل کر کے جیسے خدا سے کہتا ہے ''اب تم بتاو، تم بڑے تخلیق کار تھے یا میں !''

ستیہ پال آنند (امریکا)

مجھے جب بھی ذہانت تخلیقی حسن اور اختصار کے ساتھ نت نئے موضوعات لیے ملی ہے میں نے بلا جھجھک اسے بلند اقبال کا افسانہ سمجھا ہے۔ اردو کے افسانوی ادب میں جس تیزی کے ساتھ ڈاکٹر بلند اقبال نے مقامِ اعتبار حاصل کیا ہے وہ کم کم ہی نظر آتا ہے۔ ان کے افسانوں میں ہماری زندگی کا پرتو مکمل حقیقت کے ساتھ ملتا ہے پھر اُس حقیقت کو حسنِ اختصار کچھ اور بھی نکھار دیتا ہے۔ بلند اقبال کی اٹھان بتاتی ہے کہ ابھی اُن کو افسانے کی مزید بلندیوں کی طرف جانا ہے۔ سلطان جمیل نسیم (پاکستان)

''فرشتے کے آنسو'' میں بلند اقبال قدیم قدم پر ایک کامیاب تخلیق کار کے طور پر خود کو تسلیم کرواتے ہیں۔ اردو افسانوں میں شاید یہ کتاب اِن چند کتابوں میں سے ایک ہے جس میں کسی طرح کا غیر ضروری تکلف یا اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا

بلکہ اس کے بر عکس ہر کہانی میں قاری کو اپنی ذات کے کسی گمشدہ گوشے سے آگاہی ہوتی ہے۔ اور یوں لگتا ہے مصنف غیر محسوس طور پر قاری کو اپنے فن کا حصہ بنا لیتا ہے اور دونوں کے مابین تخلیق ایک رابطے کا کام دیتی ہے۔

تسلیم الٰہی زلفی (کینیڈا)

جب بلند اقبال کے افسانے محفلوں میں پیش کیے جاتے ہیں تو ان پر ادبی اور فنی تنقید سے زیادہ سماجی، ثقافتی اور مذہبی تنقید ہوتی ہے۔ چونکہ وہ روایتی موضوعات کے بارے میں نہیں لکھتے، اس لیے روایتی قارئین پریشان ہو جاتے ہیں۔ جہاں موضوعات (Theme) کے حوالے سے بلند کا منٹو سے تعلق ہے، ہئیت (Form) کے حوالے سے ان کا تعلق انور سجاد اور مظہر الاسلام جیسے جدید افسانہ نگاروں سے ہے جن سے محظوظ ہونے کے لئے قاری کو تخلیقی طور پر (Involve) ہونا پڑتا ہے۔ خالد سہیل (کینیڈا)

موضوعات سے قطع نظر بلند اقبال کے افسانوں میں ایک اضافی دلکشی ان میں برتی گئی ہے۔ زبان اور محاورے کی چاشنی اور چٹخارے کی بھی ہے۔ لیکن یہاں بھی حسبِ معمول موضوع کی سنجیدگی نے دامن تھامے رکھا ہے۔ بلند کے قدم نہ صرف اپنے پیش روؤں کے پابند نہیں ہیں بلکہ وہ اس خارزار میں نئی منازل کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ ضامن جعفری (کینیڈا)

ڈاکٹر بلند اقبال کی شعوری فکر اور تخلیقی تحریک

ایک برجستہ تحریر کی روشنی میں

بد قسمتی سے اردو ادب کی دنیا کے شہری ابھی تک پانچ سے پندرہویں صدی کے درمیان کے کسی تاریک یورپین قرون وسطی کے عہد میں جی رہے ہیں بس فرق صرف اتنا سا ہے کہ قرون وسطی یا مڈایول دور، ۴۷۶عیسویں میں مغربی رومن ایمپائر کے زوال سے شروع ہوا تھا اور لگ بھگ ۱۴۵۰ء میں مشرقی رومن ایمپائر کے ٹوٹنے پر ختم ہوا تھا اور ہماری پاکستانی ادبی ایمپائر یا فکری ریاست کی کلچرل تباہی یا زوال کا دور ۸۰ کی دہائی سے شروع ہوا تھا اور آج ۲۰۲۳ء میں اُس سے بھی کہیں زیادہ ناکام اور تنزل پزیر ہے کیونکہ پاکستانی معاشرہ آج بھی مڈیول دور کی یورپین سوسائٹی کی طرح جاگیردارانہ سیاسی، سماجی اور اقتصادی لوٹ کھسوٹ کا مسلسل شکار ہے۔

جس طرح سے اُس دور میں کرسچن چرچ نے حکمران طبقوں کے ساتھ گھٹ جوڑ کرکے اپنی طاقت اس قدر پھیلادی تھی کہ جاگیرارانہ ریاستوں کے حکمرانوں اور بادشاہوں کے لیےان کی سپورٹ کے بغیر حکومت کرنا کم و بیش ناکام ہوچکا تھا بالکل اسی طرح آج ہمارے ملک میں ضیا الحق کی اسلامائزیشن اور طالبانہ فکر کے نتیجے میں پیدا ہونے والی نئی نسل، اب پرانی نسل بن کر فکری اعتبار سے اس قدر بیمار، تعفن اور گھٹن زدہ ہوچکی ہے کہ اُس کے پیدا کئے ہوئے حبس اور اندھیرے میں کسی بھی قسم کی روشن خیالی کے سانس لینے یا نظر آنے کے لیے کوئی بھی جگہ نہیں بچی ہے۔

ظاہر ہے جب کبھی ہم اردو ادب کا 'ریناسانس' یا روشن خیالی کے تصور سے کسی ممکنہ تعلق یا شائد کسی امید کی بات کرتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ ہم ایک نظر مغربی ادب کے تاریخی سفر پر بھی ڈال لیں تاکہ ہمیں اندازہ ہو کہ آخر وہ کیا وجوہات تھیں جو مغربی ادب میں روشن خیالی کے امکانات کو روشن کر رہیں تھیں؟

میرا خیال ہے اُس کی پہلی وجہ تو یہی تھی کہ مغربی تہذیب کے فکری سفر نے ہزاروں برس قبل، قدیم ترین مذہبی ہیبریک اور غیر مذہبی یعنی ہیلینک روائتوں کے ٹکراو سے پرورش پائی تھی۔ ہم جانتے ہیں کہ ہیبریک کا تعلق بائبل کی آئڈیل تصور زندگی سے ہے جبکہ ہیلینک روائتوں کا تعلق اُن زمینی حقائق یا فطری انسانی مزاج یا ہیومنسٹک تصور حیات سے ہے جو قدیم یونانی اساطیر کے پس منظر میں صدیوں کے تجربات و مشاہدات کے ساتھ ساتھ وجود میں آئیں تھیں اور آج بھی اُن کے اثرات دور حاضر کے مغربی سماج میں ہمیں اس لیے نظر آتے ہیں کیونکہ تمام تر ارتقائی سفر کے باوجود ان روائتوں کے درمیان ہمیشہ سے ایک مستقل توازنی ٹکراو کی عمومی علمی فضا قائم رہی جو بہت ہی صحت مندانہ تھی کیونکہ معاشرہ فطری انداز میں اپنے سفر کو طے کر رہا تھا۔

یہ فکری و علمی سفر جب تاریخ کے سخت ترین گنجلک راستوں سے گزرا تو اور بھی تر و تازہ اور توانا ہوا اور بدترین ادوار میں جب کبھی بھی لڑکھڑایا تو اور بھی مضبوط ہوتا چلا گیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ مڈیول دور کے سخت ترین کیتھولک ماحول میں ہیبریک روائتیں، ہیلینک فکری اقدار پر غالب رہیں مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر اسی دور کے مغربی ادب میں ایک طرف سینٹ اگسٹائین کا تمثیلی کام موجود ہے تو

دوسری طرف دانتے کی ڈیوائین کامیڈی اور جعفری چاسر کی کیٹر بلی ٹیل وغیرہ بھی ملتی ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ چودھویں سے سترویں صدی کے رینیسانس یا روشن خیالی کے عرصے میں یورپ کی سماجی دنیا کی ایک نئی پیدائش ہوئی یعنی وہاں آرٹ، کلچر، سیاست، اقتصادیات بلکہ تمام تر مغربی سماج میں انقلابی تبدیلیاں آتیں چلی گئیں اور ظاہر ہے اُس کی وجہ اُس دور کے نئے سائنسی قوانین اور جدید مذہبی و سیاسی نظریات تھے اور ان کے پس منظر اور پیش منظر میں ہمیں کئی ایک بڑے واقعات بھی نظر آتے ہیں یعنی رومن ایمپائر کے سیاسی کنٹرول کا ختم ہو جانا، یورپ میں جاگیدارانہ نظام کا خاتمہ ہو جانا، ایک نئے بورژوازی سماج کا پیدا ہو جانا، پروٹیسٹینٹ ری فارمیشن کا کتھولک چرچ کو چیلنج کر دینا اور تمام تر سیاسی منظر نامے کا دو تین سو سالوں میں قطعی طور پر بدل جانا یعنی فرانس، انگلینڈ اور اسپین جیسی اقوم کا نئی طاقتیں بن کر دنیا میں سامنے آجانا بھی شامل ہے مگر ان سب باتوں کے باوجود ادبی دنیا کے اعتبار سے اگر ہم دیکھیں تو ایک بات اور بھی اہم ہے جسے کسی طور بھی ہم نظر انداز نہیں کر سکتے کہ اس دوران اس ساری ری برتھ کے پراسس میں یونان کے کلاسیکل ادب، اُس کے فلسفے اور آرٹ کی بھی حیات نو کی گئی یعنی اس عرصے میں روائتوں کے تسلسل کو توڑا نہیں گیا بلکہ جدید تصورات جیسا کہ فرد کی شناخت (سیلف آئیڈینٹی انڈ یویجول ازم) اور شخصی آزادی، ہیومن ازم یعنی انسانوں کی زندگی اُن کے احساسات جذبات اور معاشرتی مسائل کی حقیقی وسائل کی روشنی میں تفہیم کی گئیں اور پھر اس کے بعد بھی یہ سلسلہ یہی نہیں رکا بلکہ روح جیسی مذہبی فکر، مذہبی اخلاقیات آرٹ و سائنس پر دلائل اور ان کے مسائل پر آزادانہ بحث کو

بھی ادب عالیہ کا حصہ بنادیا گیااور ایک آئڈیل یا مثالی نشاۃ ثانیہ سے آراستہ انسان سے بھی یہ توقع کی گئی کہ وہ اپنے تمام تر جواہر کو بروئے کار لاکر نہ صرف اپنی زندگی بلکہ اپنے معاشرے کی بھی تکمیل کے لیے کوشش کرے گا، شائد یہی وجہ تھی کہ بعد کے ادوار میں مغربی ادب بقول کیسے ہمیں ہیگل کے تھسیس، انٹی تھسس اور سنتھسس کی فلسفیانہ فکر سے گزرتا ہوا نیو کلاسیک سے رومانس ازم، نیچرل یا رئیل ازم اور پھر مارڈرن ازم سے پوسٹ مارڈرن ازم حتیٰ کہ میٹا ماڈرنازم اور اب نیو مٹیریل ازم اور پوسٹ ڈیجیٹل ازم بلکہ پوسٹ میلینا الزم کی طرف ایک توازن سے بڑھتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔

دوسری جانب اردو ادب کا سماج اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ایک سراسر مختلف سماج ثابت ہوا کیونکہ اگر ہم سوچیں کہ 'ادب اور سماج کا رشتہ تو کسی بھی سماج میں یکساں نوعیت کا ہی ہوتا ہے' تو جس طرح مغربی ادب کا ارتقائی سفر ہمیں فطری سا نظر آتا ہے وہ اردو سماج میں ہمیں کہیں سے بھی میل کھاتا ہوا دکھائی نہیں دیتا ہے حالانکہ مغرب کا دورانیہ کس قدر طویل بھی تھا اور مشکل تر بھی تو سوال یہی ہے کہ آخر کیا بنیادی یا فن ڈامینینٹل وجہ تھی کہ اردو ادب اپنے تمام تر ارتقائی پر اسس میں خصوصی طور پر روشن خیالی جیسے تصورات سے عمومی طور پر محروم ہی رہا؟

اس لحاظ سے ایک بڑا سوال تو سامنے کا یہی تھا کہ کیا ادب معاشرے کا عکس ہوتا ہے یا معاشرہ ادب کو ریفلکٹ کرتا ہے؟ ظاہر ہے جس معاشرے میں قاری کا یہ عالم ہو کہ وہ بیچارہ ادب کی تعریف تک کا تعین تک نہیں کر سکتا وہ کسی بھی طور ادب کی ریفلیکشن کا تو بوجھ ہر گز نہیں اٹھا سکتا۔

مجھے یہ خیال یوں بھی آیا کہ جب میں اس سارے پس منظر میں ٹیری ایگلٹن کی ایک کتاب 'لٹرری تھیوری' دیکھ رہا تھا، انہوں نے اپنی کتاب میں اس معاملے پر بڑی فلاسفیانہ بحث کی تھی کہ ادب اصل میں کیا ہے؟ ظاہر ہے میں اردو ادب کے پس منظر میں ہی اس تھیوری کو بھی اس خیال سے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ادب کے عطر یعنی ایسنینس یا معنویت کا اگر ایک اندازہ ہو جائے تو ہمیں کسی بھی طرح کی سماجی تھیوری یا نظریہ کی اُس پر 'پراپر یا ام پراپر ایپلیکشن' کا بھی اندازہ ہو جائے گا، تو ظاہر ہے اس ضمن میں کئی ایک خیالات تھے جو اہمیت کے حامل تھے مثلاً یہ سوال بھی کہ کیا ادب صرف تخلیلاتی یا افسانوی متن کا نام ہے؟ یا محض اچھی یا بہت ہی گاڑھی سی لسانیات کا نام ہے؟

اور پھر ایک بار یہ خیال بھی میرے ذہن سے گزرا کہ نہیں بھائی اب ایسا بھی نہیں ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو مونٹیانہ اور میتھو آرنلڈ کے ادبی ارٹیکلز اور گراں قدر مضامین کا کیا بنے گا؟ اگر طلسم ہوشربائی زبان ہی اصل میں ادب ہے تو ڈپٹی نذیر احمد بیچارے کہاں جائیں گے اور سعادت حسن منٹو کا کیا ہوگا؟، اگر زمینی حقائق ادب نہیں ہے تو انیس کے مرثیوں اور جوش ملیح ابادی کی یادوں کی بارات کا پھر بھلا کیا بنے گا؟

اس طرح سے ہوتے ہوئے جب میں سماج کے ویلیو سسٹم، ایتھکس یعنی اخلاقیات اور خود قاری تک آپہنچا تو میرے لیے ادب کی تعریف یک سر ہی بدل گئی بلکہ ایک اہم ڈائمنشن کو بھی میرے سامنے لے آئی کیونکہ وہاں میں نے اپنے تئیں اس بات کو اخذ کیا کہ ایک 'بائی آس' یعنی جانبدارانہ سوسائٹی میں ادب تو 'واقعی ادب'

جب ہی بن پائے گا جب وہ وہاں کی جانبدارانہ اور مصنوعی اخلاقیات کو بھی اسائین کرے گا یا اپنائے گا۔

اِس دور میں جو سماجی اسٹرکچر یا معاشرتی ساختیاتی ڈھانچہ اردو ادب کو نصیب ہو رہا ہے خصوصا پچھلی چار دہائیوں سے، وہ تو خیر سے انتہائی غیر متوازن اور پولیرائزڈ ہو چکا ہے۔ یہ ایک ایسی ادبی سوسائٹی بن چکا ہے جس میں کسی بھی نقطہ نظر کا فیصلہ صرف اور صرف بوسیدہ روائتوں کی روشنی میں ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ سماجی قدروں کا یہ عالم ہے کہ اگر ایک جانب ہمیں فیمن ازم کو عورتوں کے حقوق اور معاشرتی مساوات کو ضروری سمجھنے والی ایک انتہائی محدود سی نسل ملے گی جو فہیمدہ ریاض اور کشور ناہید کی شاعری کو ادب پارے سمجھ رہی ہوگی تو دوسری طرف ایک پورا مجموعی معاشرہ سیکچوئل پیٹیارٹیکل ڈوکٹرائین کو سماجی ضرورت سمجھنے کے خاطر گلی کوچوں میں بے شرم بے حیا، مغرب زدہ مغرب زدہ کے جذباتی نعرے لگاتے ہو مل جائیگا جو اس سارے انقلابی فیمنسٹک لٹریچر کو جس نے مغربی معاشرے کی نئی طرز سے پرورش کی اور اسے مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے ایک متوازن ہیومن سوسائٹی کا درجہ عطا کیا، اُسے ایک ناقص یا ٹریش کہہ کر سیدھا گاربیج باکس میں پھینک دے گا۔

ایک ایسے بدنصیب سے سماج میں جہاں سیکولر کے معنی 'کفر' کے طور پر لیے جاتے ہو اور جہاں لبرل کو لبرل ازم کی انقلابی سماجی تحریک یا نشاۃ ثانیہ کے پس منظر میں سمجھنے کا بجائے محض اپنی سیاسی بیان بازیوں کے خاطر، مجرمانہ طور پر نظر انداز کرتے ہوئے کسی بھی سوکالڈ 'عظیم تر سیاسی لیڈرز' کے سیاسی بیانیہ کو جسم و جاں سے اپنا کر اور دوسری اقوام کے لیے ایک گالی بنا لیتے ہو اور اپنے علمی طور پر

ناقص سماج میں شعوری طور پر شہید نئی نسل کو ان ڈوکٹرینیٹ کرنے میں رات دن جتے ہوئے دکھائی دیتے ہو، ایسے سماج میں اگر تھوڑا سا روشن خیال ادب (ٹوٹی ہوئی دیوار اور کھوئے ہوئے صفحات جیسے ناولز اور فرشتے کے آنسو جیسی کہانیاں) نظر سے گزر بھی جائے تو بھلا کس کی فکری ضرورت کو پورا کر پائے گا؟ جہاں علم و ادب سے فیض اٹھانے کے بجائے اسے 'مغربی و مشرقی' جیسے جغرافیائی سیکٹرازم سے تقسیم در تقسیم کر دیا گیا ہو یا جس سماج میں مغربی ادبی آئڈ یالوجی کو سیاسی اور مذہبی نعروں سے آلودہ کر کے ٹیکسٹ بکس میں شامل کر دیا گیا ہو تو ایسے حالات میں تو 'ادب کی ضرورت اور تعریف' کا تعین صرف لسانیات کی ترکیبوں اور متن کی افسانوی اور تخلیاتی شکلوں میں ہی تلاش کیا جائے گا۔

میرے خیال میں ادب کے متن کے لیے، اُس کے حجم اور اُس کی بنیادی تعریف کے لیے اچھی یا بری سماجی ویلوز کا ہونا ضروری ہے مگر وہ ویلیوز قاری کے زریعے سے ہی اُس کا تعین کریگی مگر مشکل یہی ہے کہ اردو ادب کو ۸۰ کے بعد سے جو سوسائٹی نصیب ہوئی ہے وہ انسانوں کے بجائے سر جھکائے ہوئے بھیڑوں اور گلیوں میں ناچتے ہوئے شاہ دولے کے چوہوں کی سوسائٹی ہے۔

اچھا اگر ہم روشن خیالی کو صرف پندرہویں صدی کے ریسپانس تک ہی محدود نہ کریں ؟کیونکہ اس سے کسے انکار ہے کہ یہ ایک سراسر سبجیکٹو ٹرمنالوجی ہے، کیونکہ ہمیں پتہ ہے کہ ہر دور میں جو پیغمبر، جو ریفارمرس، فلاسفرز، ادیب اور جو بھی سوچنے والے لوگ دنیا میں تشریف لائے وہ سب بزرگان اپنے اپنے عہد کے لحاظ سے 'روشن خیال ترین' لوگ تھے کیونکہ وہ آنے والے عہد کی سچائیوں کو سمجھتے تھے یا آنے والے وقت کی چاپ کو محسوس کر لیتے تھے اور یوں اُس کے مطابق اپنے

فالورز اور اپنے ریڈرز یا قاری کو ڈھالنے کی کوشش کرتے تھے اور ان کے فالورز بھی اُن سے متاثر اسی لیے ہوئے تھے کیونکہ ان عظیم لوگوں کے بدولت علم امرا سے نکل کر عوام الناس تک پہنچا تھا اور یوں اُن کا عہد اپنے کانٹیمپرری دور کے لحاظ سے سبجیکٹولی روشن خیال تھا۔

آخر یہ سقراط ہی تو تھا جس نے فلسفے کو ایتھنز کی گلی کوچوں تک پہنچادیا تھا شائد اس یقین کے ساتھ کہ فلسفہ ہو یا مذہب ، ادب ہو یا سائنس وہ عوام الناس کا پورا پورا حق ہے کہ عوام الناس اور خاص الناس کا فیصلہ صرف اور صرف علم یا کتاب ہی کرے گی۔

خود پندرہویں صدی میں رینیسانس یا روشن خیالی کی تحریک ، یورپ کے ہزار برس کی تاریک خیالی میں اجالے کا سبب جب ہی بنی جب پرنٹنگ پریس کی مدد سے وہ تمام تر نئی سوشل یا پولیٹیکل آئیڈیالوجز عام لوگوں تک پہنچتی چلی گئی ۔ ہر دور کی تاریخ گواہ ہے کہ اس عہد کا حکمران نئے یا جدید خیالات کو اپنے اقتدار کے لیے ہمیشہ سے خطرہ ہی سمجھتا تھا اور اُس کی سخت ترین مخالفت کرتا تھا۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ مغرب میں بھی ۱۶۶۴ء تک لوگوں کو کتابیں چھاپنے کے الزام میں موت کی سزائیں دی جاتی رہیں تھیں۔

سب سے اخری سزائے موت کتاب چھاپنے پر ۱۶۶۳ء میں جان ٹوائین کو دی گئی تھی جس نے اُس کتاب کے رائٹر کا نام بتانے سے انکار کردیا تھا کیونکہ رائٹر نے اپنی کتاب میں بادشاہ کو عوام کے سامنے جواب دہی کے پابند ہونے کے لیے لکھا تھا کہ اگر وہ اپنی رعایا کو جواب دے نہیں ہوگا تو اس کی عوام کو پورا حق حاصل ہے کہ وہ اس کے خلاف ہتھیار اٹھائے اور بغاوت کردیں۔

ہر دور میں کتاب ہی تو تھی جس کی وجہ سے اُس دور کا رینسیانس روشنی اور جدید عہد کا سبب بنا مگر بدقسمتی سے آج، اردو ادب کی دنیا میں کتاب تو موجود ہے مگر اُس کو پڑھنے والی آنکھیں اور سمجھنے والے ذہن نہیں ہیں۔ اس لیے میرے خیال میں پچھلی چند دہایوں کی بدترین سماجی کوششوں اور منفی جد وجہد کے نتیجے میں اس وقت اردو ادب کی دنیا میں خصوصا اور ہمارے معاشرے میں عموما روشن خیالی کے امکانات تاریک تر ہو چکے ہیں۔

Ontario

Congratulations

FROM THE PROVINCE OF ONTARIO

Presented to

Baland Iqbal

In celebration of

First Annual Rawal TV Gala

Diversity is Ontario's strength. The rich heritage and culture of the South Asian community in the Greater Toronto Area and across Ontario has made valuable contributions to our province's social, cultural and economic wellbeing.

We are One Ontario, working together to strengthen a province where everyone has the opportunity to connect, contribute, and enjoy a high quality of life.

Thank you for your hard work and dedication in making Ontario, a great place to live.

December 05, 2013

The Honourable Michael Coteau

Minister of Citizenship and Immigration

OREGON HEALTH & SCIENCE UNIVERSITY

OHSU

To all to whom this writing may come, Greeting:
Be it known that

Bland Iqbal, M.D.

having acceptably fulfilled the duties of

Fellow in Geriatric Medicine

in the University Hospital and Clinics and affiliated Hospitals for a period of one year beginning March 1, 2007 and ending February 29, 2008 is hereby granted this Certificate in acknowledgment of services loyally performed with all rights and privileges due thereunto appertaining
Dated at Portland, Oregon, February 29, 2008.

President

Vice President and Executive Director
OHSU Hospitals and Clinics

Dean, School of Medicine

Associate Dean, Graduate Medical Education

Chair of Department, School of Medicine

Program Director

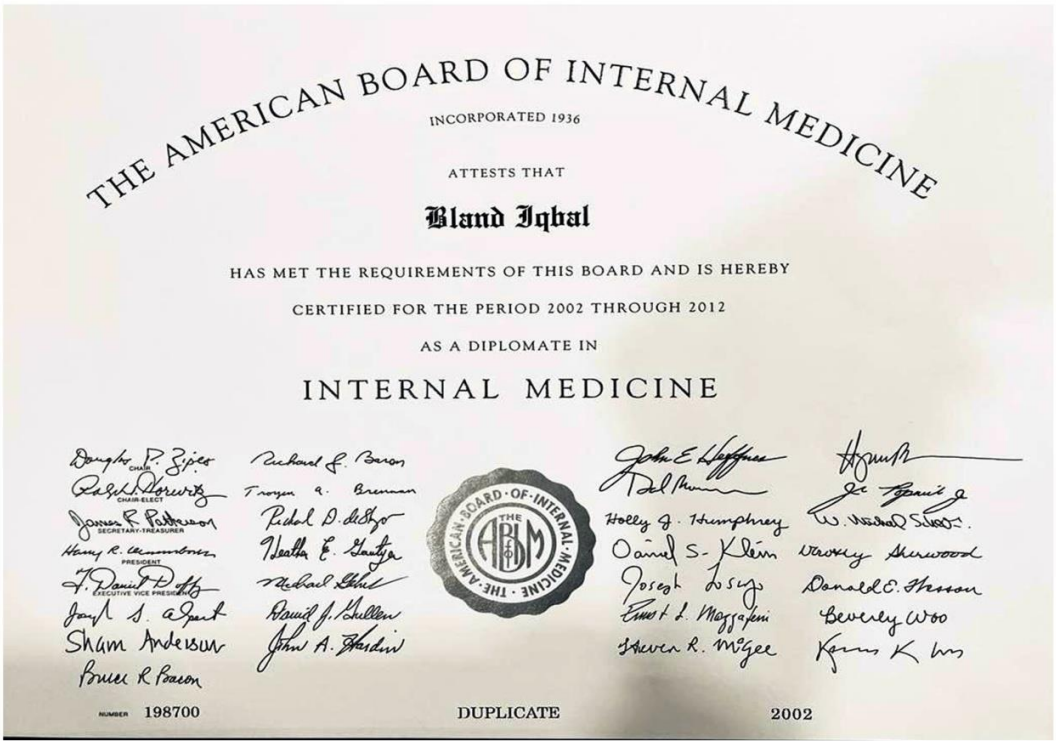

THE AMERICAN BOARD OF INTERNAL MEDICINE

INCORPORATED 1936

ATTESTS THAT

Bland Iqbal

HAS MET THE REQUIREMENTS OF THIS BOARD AND IS HEREBY CERTIFIED FOR THE PERIOD 2002 THROUGH 2012

AS A DIPLOMATE IN

INTERNAL MEDICINE

THE AMERICAN BOARD OF INTERNAL MEDICINE

NUMBER 198700 DUPLICATE 2002

HOUSE OF COMMONS
CANADA
This certificate is presented to
Baland Iqbal
In recognition of your contributions on the occasion of
Rawal TV's Annual Dinner & Awards Gala
Signed Dec 5, 2013
Kyle Seeback, Member of Parliament
Brampton West

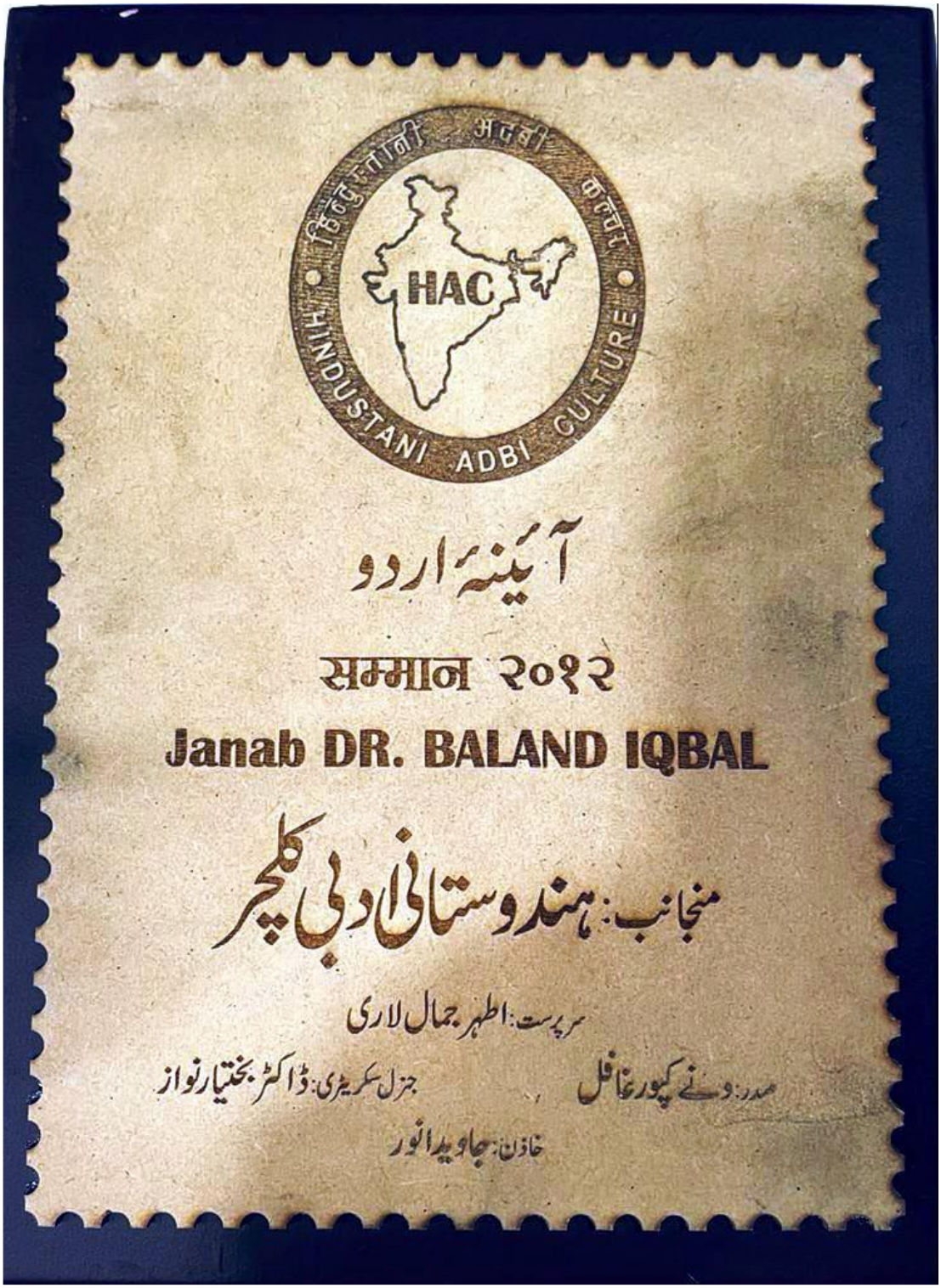
HAC
HINDUSTANI ADBI CULTURE
آئینۂ اردو
सम्मान २०१२
Janab DR. BALAND IQBAL
منجانب: ہندوستانی ادبی کلچر
سرپرست: اطہر جمال لاری
صدر: دنے کپور غافل
جنرل سکریٹری: ڈاکٹر بختیار نواز
خازن: جاوید انور

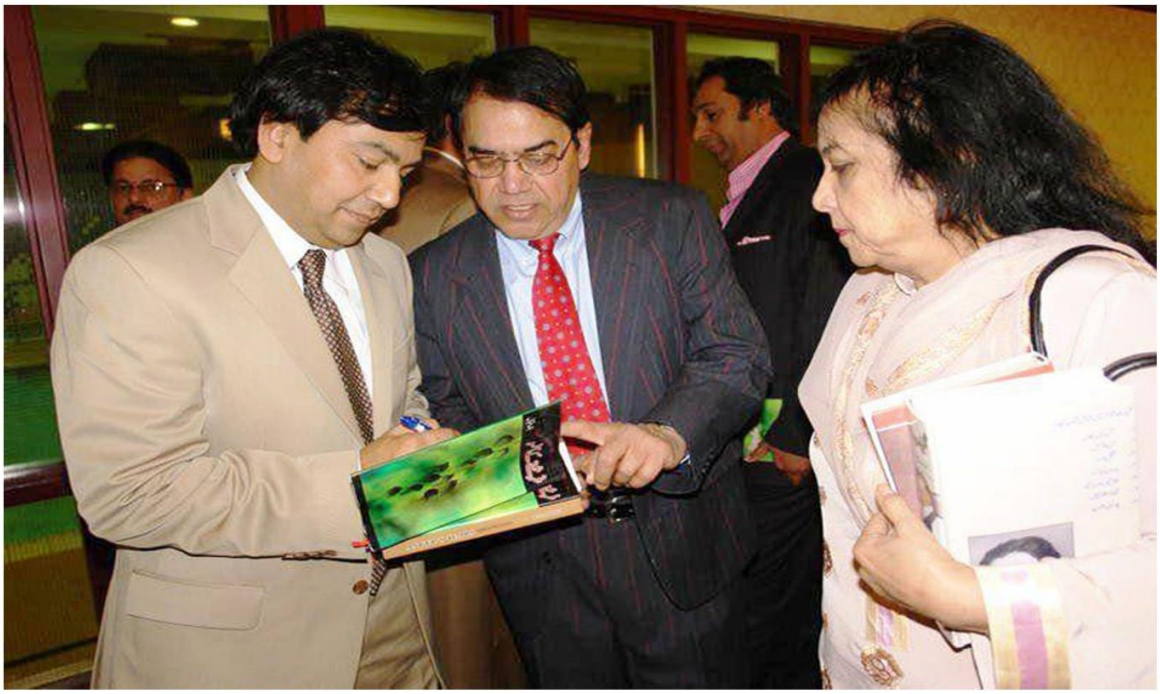

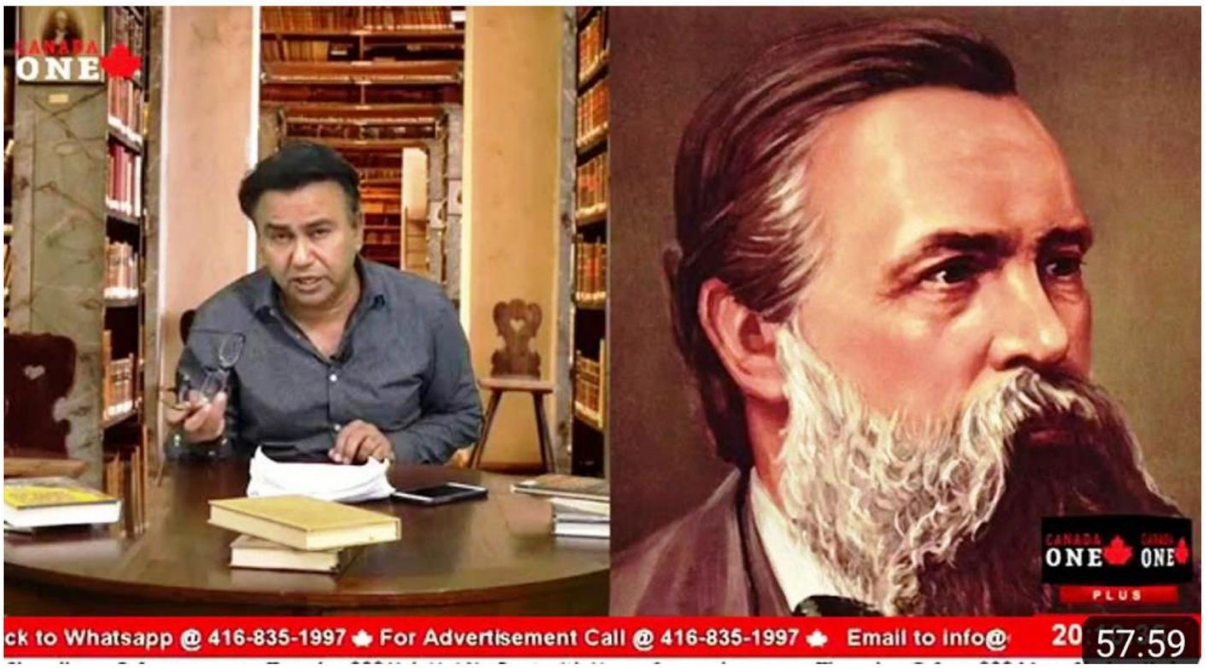

CANADA
ONE
CANADA ONE
ONE
PLUS
ck to Whatsapp @ 416-835-1997 For Advertisement Call @ 416-835-1997 Email to info@
57:59

11 6'98

بزمِ اردو کی جانب سے
Taqreeb-e-Ijra
تقریبِ اجرا
Kulliat-e-Shair
Kahan Aa Gaye Hum
Farishtay Kay Ansoo
کلیاتِ شاعر
کہاں آ گئے ہم!
فرشتے کے آنسو
On Saturday, 21 March 2009
SUDHIR NARAIN
Of Agra Gharana
performed selected Ghazals
of renowned Urdu Poets.
کلیاتِ شاعر
حمایت علی شاعر

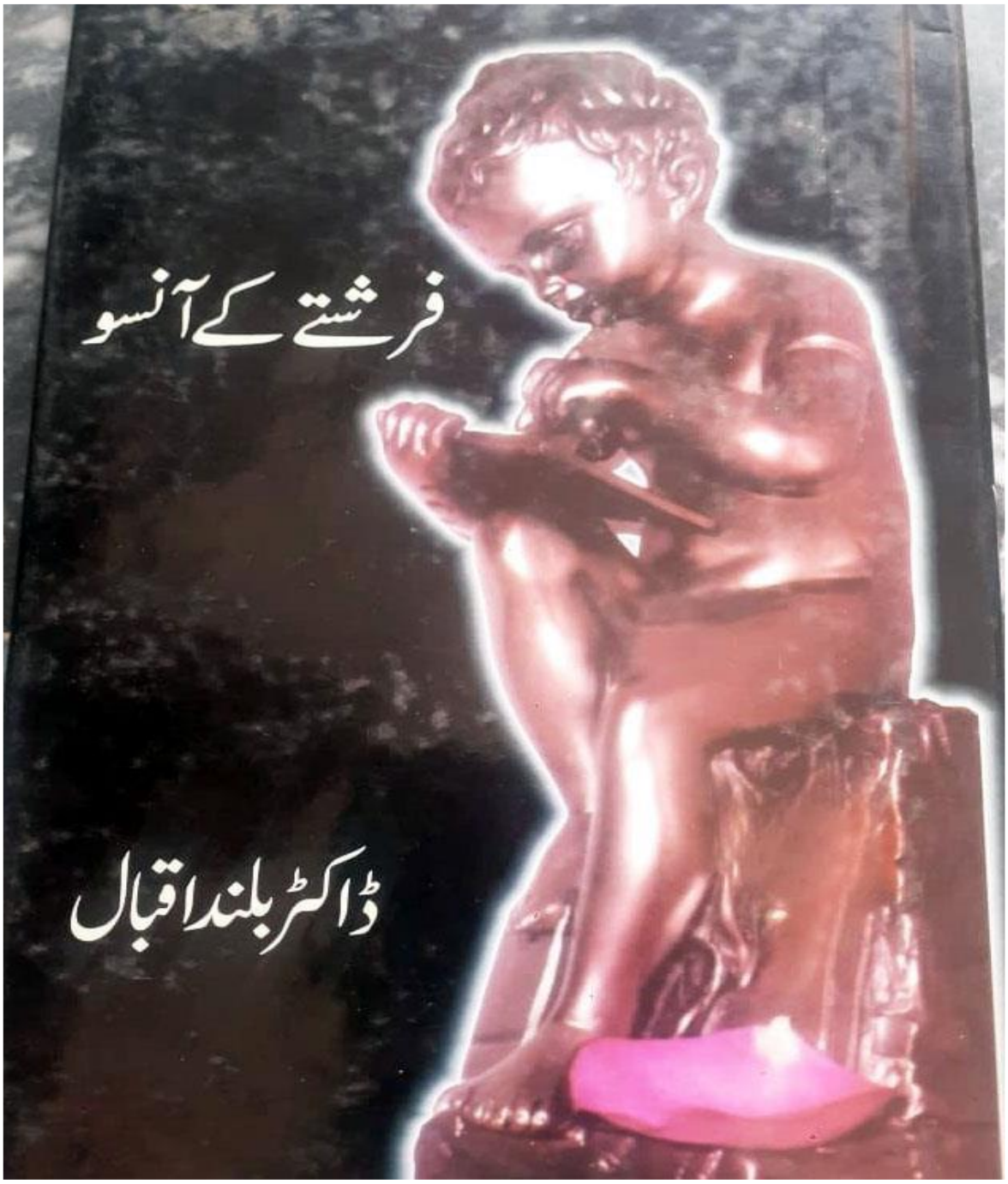
فرشتے کے آنسو
ڈاکٹر بلند اقبال

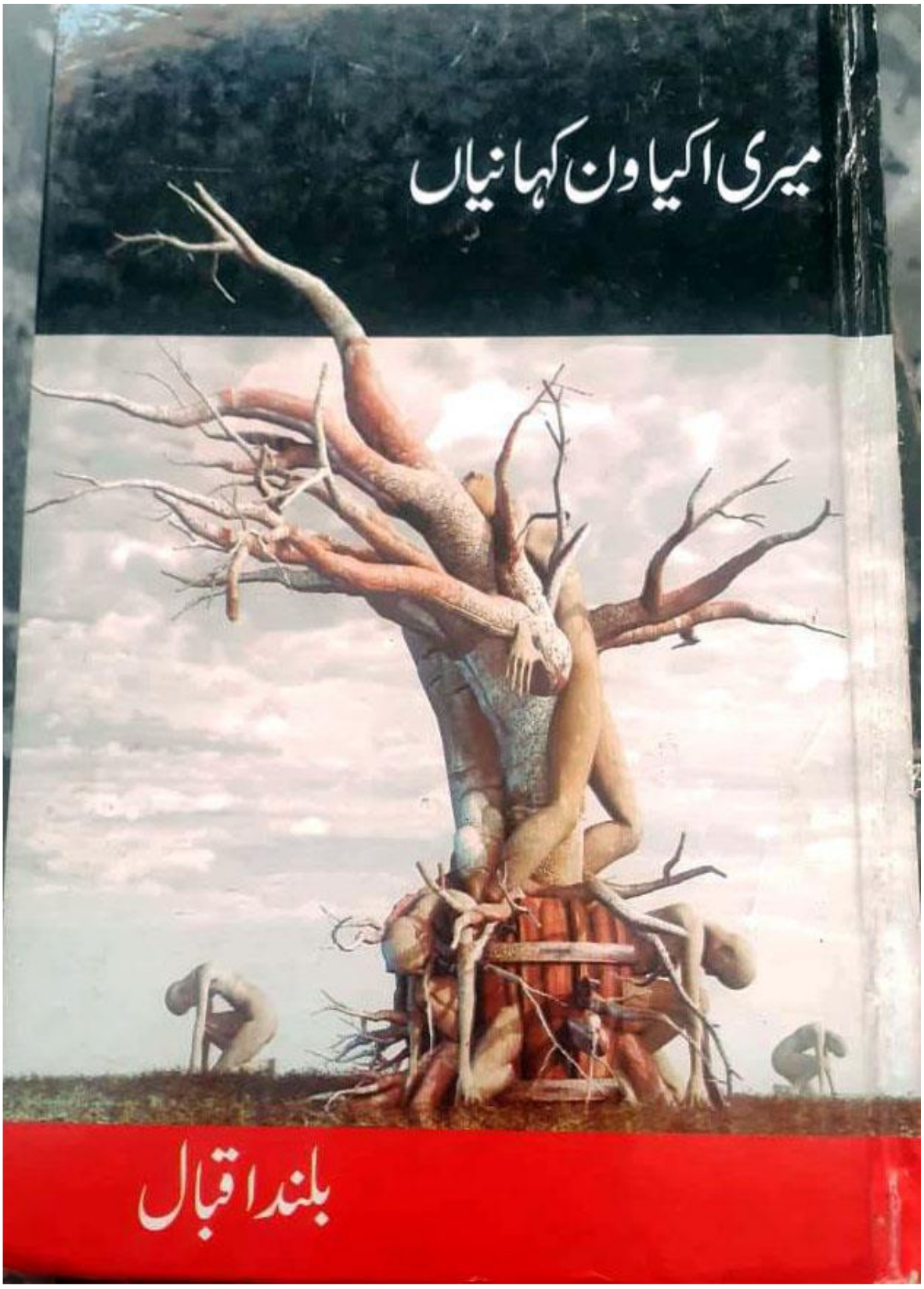
میری اکیاون کہانیاں
بلند اقبال

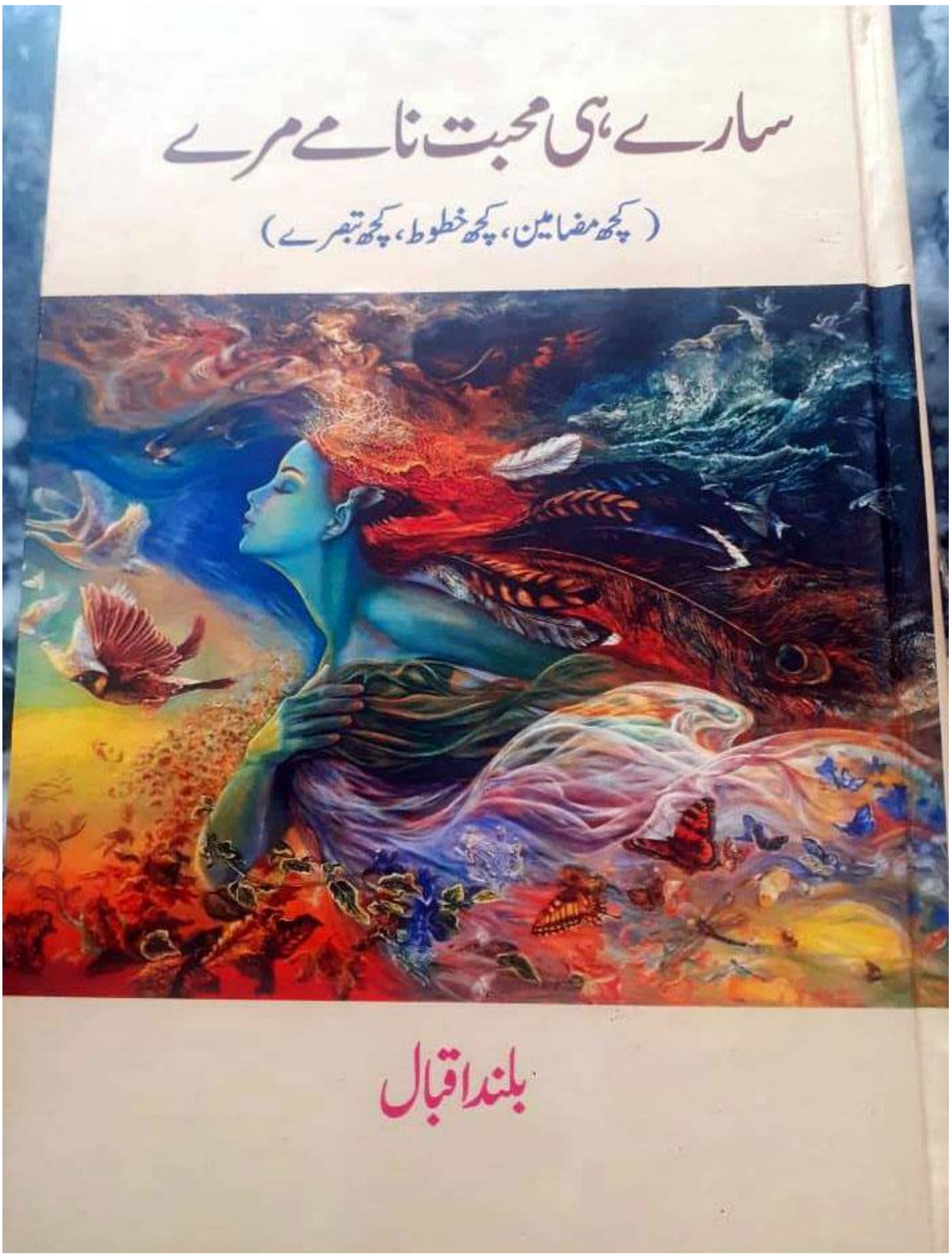
سارے ہی محبت نامے مرے
(کچھ مضامین، کچھ خطوط، کچھ تبصرے)
بلند اقبال

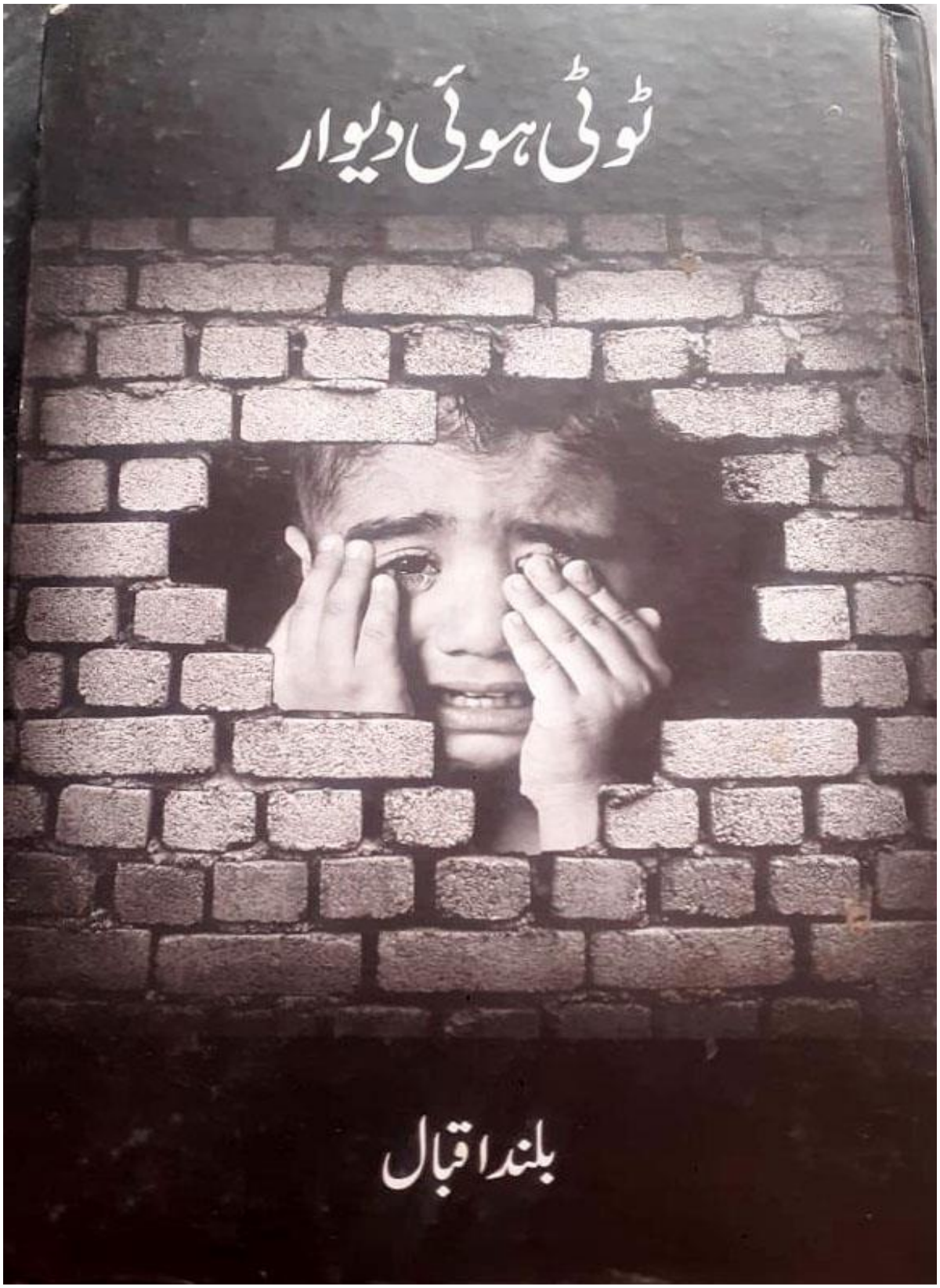
ٹوٹی ہوئی دیوار
بلند اقبال

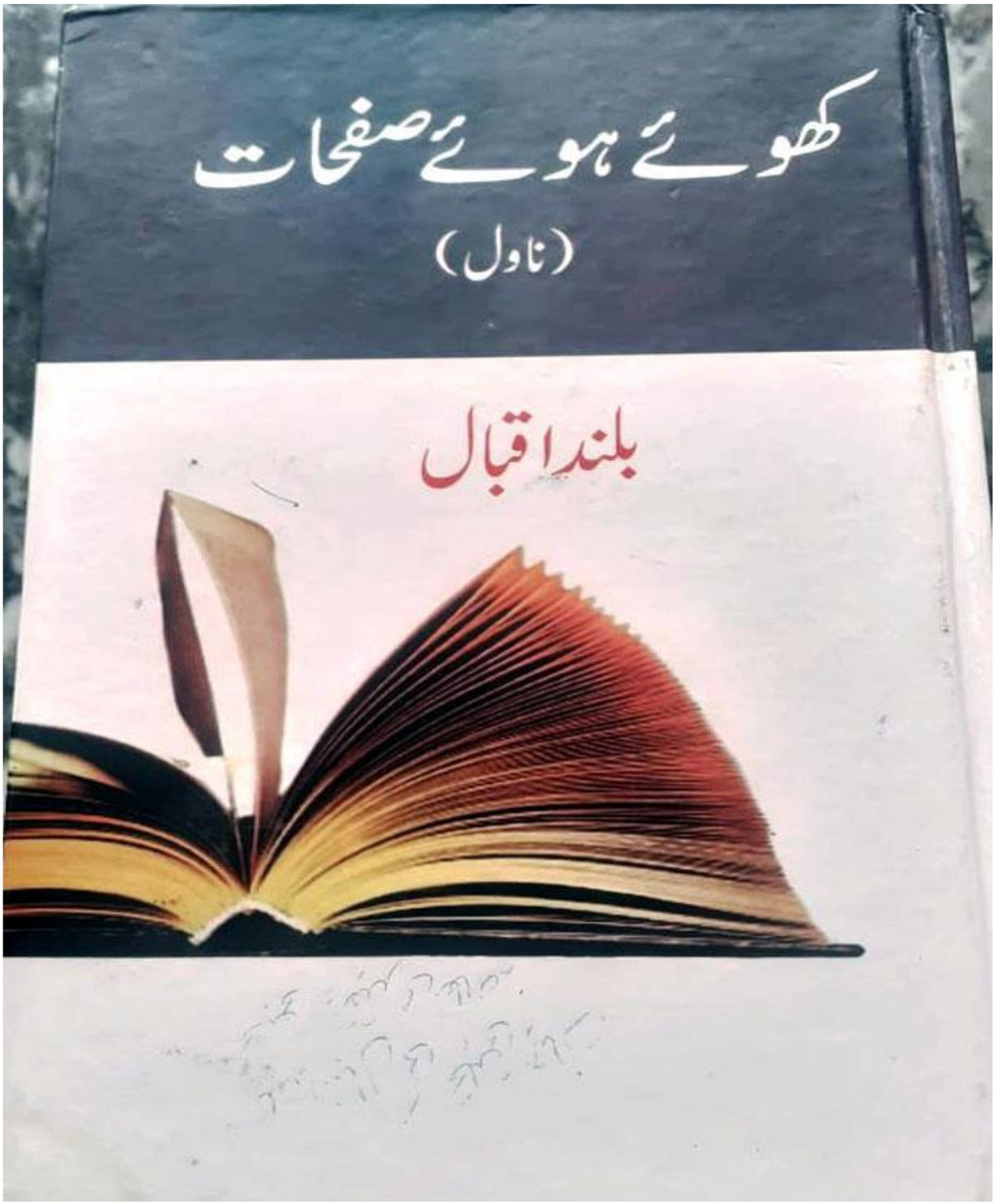
کھوئے ہوئے صفحات
(ناول)
بلند اقبال

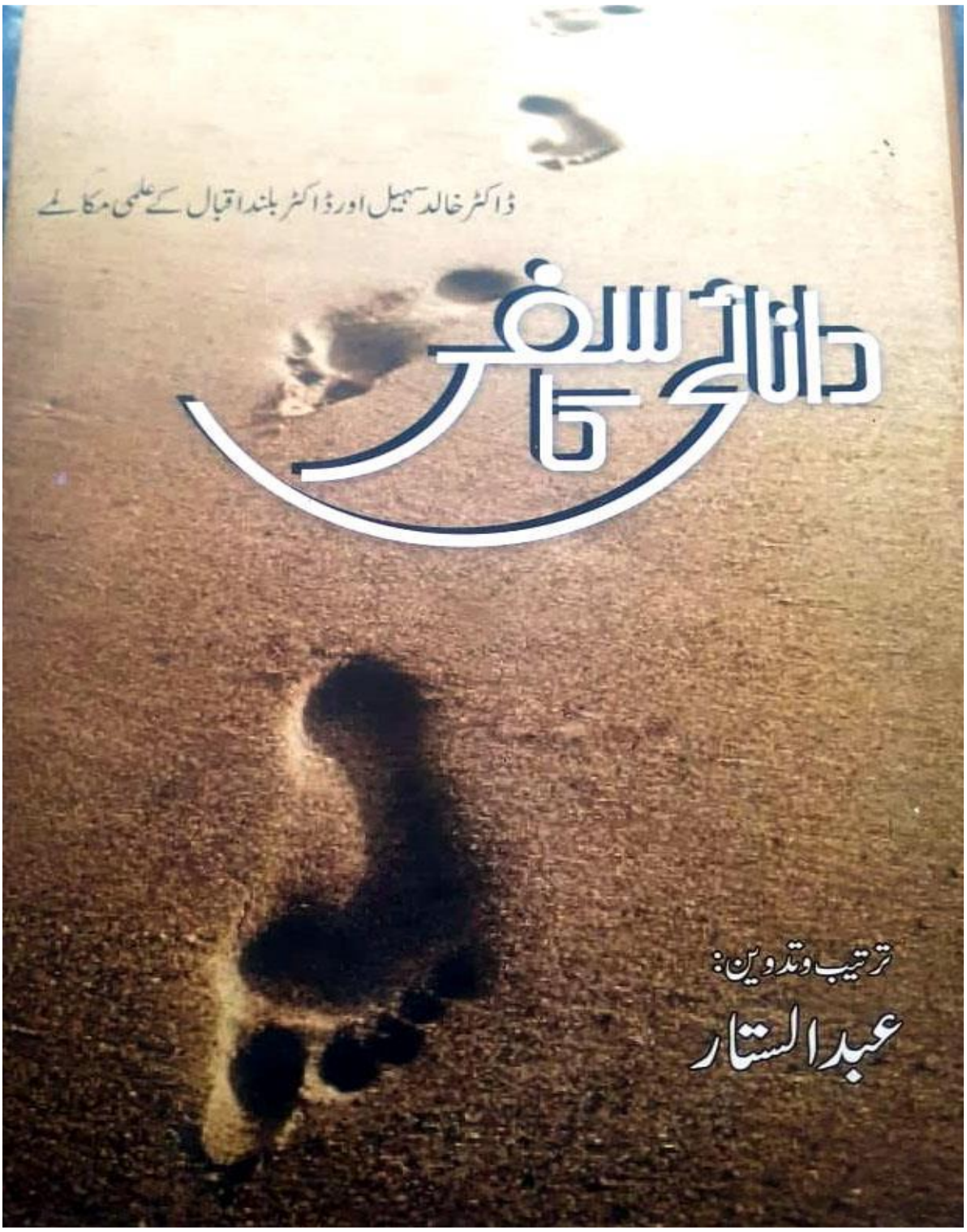
ڈاکٹر خالد سہیل اور ڈاکٹر بلند اقبال کے علمی مکالمے
دانائی کا سفر
ترتیب و تدوین:
عبدالستار

RTV
RAWAL
Centurion Award
This is to Congratulate
Baland Iqbal
On your 100 Episodes of
Password - Healthy & Happy Living
Thank You for your continuous hard work and
dedication that you have portrayed
in your show. We are honoured to
have you as an important member of the
RawalTV Team.